بیماری یا روحانی تجربہ

(دوسرا ایڈیشن)

حیدر قریشی

بیماری یا روحانی تجربہ

حیدر قریشی

BEEMARI YA ROOHANI TAJRABA

By:Haider Qureshi

مجھے جو کچھ پیش آیا، میں نے جو روحانی تجربہ کیا، اسے جہاں تک بیان کرنا ممکن تھا میں نے بیان کر دیا ہے۔ میں اسے اپنا ادنیٰ کشف سمجھتا ہوں جو عام کشوف سے مختلف ہے اور جس میں مجھے میرا پورا جسم بھی شریک محسوس ہوتا رہا۔ میرے دادا، دادی اور ابا جی کے تجربات سے جڑا ہوا میرا تجربہ میرے لئے ایک روحانی تجربہ تھا۔ میں نے اپنے تجربے میں خود آپ کو شریک کیا ہے۔

آپ اسے ایسا ہی سمجھیں، یا اسے میری بیماریوں کا اثر سمجھیں۔

دواؤں کا ری ایکشن سمجھیں یا کچھ اور سمجھیں۔

آپ کو اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

میرا لکھا ہوا اپنی جگہ موجود ہے۔ اور موجود رہے گا۔ دماغ کی بیداری کے ساتھ میں نے اسے سچے دل سے لکھا ہے، ہو سکے تو آپ دل سے سمجھیں۔

کہیں کہیں میں نے اپنی بعض باتوں کو ایک سے زیادہ مرتبہ بیان کیا ہے۔ یہ ان باتوں کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ضروری تھا۔ جب آپ ان باتوں پر غور کریں گے تو آپ کو ان کے دہرائے جانے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اپنی اذانیں، ساری شامیں، تیرے دم سے یار

تیرے ہاتھ ہوائیں ساری تیرے ہاتھ میں ڈور

(ص 47۔ اکتوبر 2020ء)

فروری 2020ء سے جنوری 2022ء تک میں نے کینسر کے تین زوردار حملوں کا سامنا کیا۔ پہلے فروری 2020ء میں بائیں گردے میں ٹیومر ملا اور وہ گردہ ہی نکال دیا گیا۔ پھر 26 جون 2020ء کو بلیڈر میں کینسر دریافت ہوا اور اس کا علاج مکمل ہونے سے پہلے 12 مئی 2021ء کو برین ٹیومر بھی ظاہر ہو گیا۔ کینسر کے ان سارے حملوں کے باوجود اللہ نے اپنے بہت ہی خاص فضل و کرم سے مجھے کینسر سے مکمل نجات عطا کر دی ہے۔ (ص 92۔ جنوری 2022ء)

حیدر قریشی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

وَتُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیّتِ وَتُخرِجُ المَیّتَ مِنَ الحَیّ (ال عمران:۲۷)

اور تو نکالے زندہ، مردہ سے اور نکالے مُردہ، زندہ سے

بیماری یا روحانی تجربہ

حیدر قریشی

Beemari ya Roohani Tajraba?

by

Haider Qureshi

Year of 1st Edition E-Book: 2020

Year of 2nd Edition: 2022

ISBN 978-93-94616-56-1

` 200/-

نام کتاب	:	بیماری یا روحانی تجربہ
مصنف	:	حیدر قریشی
سرورق	:	مصطفیٰ کمال پاشا
اشاعت اول	:	(ای بک) اکتوبر ۲۰۲۰ء
اشاعت دوم	:	فروری ۲۰۲۲ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

مصنف کا پتہ

Haider Qureshi Rossertstr.6, 65795-Hattersheim, Germany.

E-Mail:

haider_qureshi2000@yahoo.com / hqg786@gmail.com

WhatsApp: 00496190930078

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)

B.o. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 45678203, 45678286, 41418204, 23216162

E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

ابا جی اور دادا جی کے نام

دل میں بسنے والے دُور بھلا کب ہوتے ہیں
دنیا کی نظروں میں بے شک دُوری ہوتی ہے

ابا جی اور دادا جی دونوں کے حوالے سے

وہ برڑ
کب کا صحرا کے سینے میں گُم ہو چکا ہے
مگر آج میں جانتا ہوں/ وہ میری ہی تصویر تھا/ میرا اوتار تھا/ میرا چہرہ تھا وہ
میں نے خود اُس کو بھیجا تھا/ اپنی طرف
اُسے خود بُلایا تھا اپنی طرف!

اور پھر۔۔۔ یوں ہُوا/ مَیں نے اِک بار پھر/ برڑ کا بہروپ بدلا
خود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر/ وہاں، جس جگہ اب سے پہلے/ خُشک ریت کا ایک صحرا بچھا تھا
مَیں پتّوں کا اِک تاج/ سر پر سجائے/ کھڑا ہو گیا
پھر مَیں
اپنے ہی چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں/ اپنی ہی ریشِ مبارک کے سائے میں
دھرتی کی مسند پہ/ تشریف فرما ہُوا/
آلتی پالتی مار کر/ ایسے بیٹھا کہ جیسے ازل سے/ یہی میرا مسکن تھا
آنکھوں کو میچے/ مَیں اپنے ہی محور پہ/ گردش سی کرنے لگا
اپنے ''ہونے'' کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں
خُود اپنے ہی منظر کو/ تکنے لگا!

(ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' سے اقتباس)

مذہب، سائنس اور ادب

مجھے مذہب اور سائنس کے اس پہلو سے دلچسپی ہے جہاں سائنس آزادانہ طور پر کائنات اور اس کے بھیدوں کی نقاب کشائی کا کوئی مرحلہ سر کرتی ہے اور **لا الہ** ..کا منظر دکھاتی ہے اور وہیں کہیں آس پاس سے مذہب کی بخشی ہوئی کوئی روحانی کیفیت یا کوئی مابعد الطبیعاتی لہر مجھے اس نفی میں سے اثبات کا جلوہ دکھاتی ہے اور **الا اللہ** کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔اور یہ سارا سائنسی اور مابعد الطبیعاتی آہنگ میری ادبی جمالیات میں میری ادبی استطاعت کے مطابق اپنے رنگ دکھانے لگتا ہے۔کمپیوٹر کے چِپ کی کارکردگی منکر نکیر اور یومِ حساب پر ایمان پختہ کرتی ہے تو کلوننگ کا تجربہ حیات بعد الموت کا سائنسی ثبوت دے کر اس عقیدہ پر مجھے مزید راسخ کرتا ہے۔خلا کو نکال دینے سے ساری کائنات کا مادہ سوئی کی نوک پر سما جانے ،اور پھر کسی اینٹی میٹر کے اس سے ٹکرانے کے نتیجہ میں اس کے بھی غائب ہو جانے کا سائنسی دعویٰ مجھے اس قیامت پر پکا یقین دلاتا ہے جس میں ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی ہستی باقی رہے گی۔میرا شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ سائنس خدا کی نفی کرتے ہوئے اسی کی طرف جا رہی ہے، مذہب روحانی طور پر اسی کی طرف سفر کراتا ہے اور ادب بھی جمالیاتی سطح پر اسی حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سفر کرتا ہے۔اور بس۔۔۔

(میری کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے باب ''رہے نام اللہ کا!'' سے اقتباس)

روحانیت سے کیا مُراد ہے؟

برادرم نذر خلیق نے مجھے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔انہوں نے میری دوسری تحریروں کے بعض مندرجات سے عمومی طور پر اور یادوں کی قسط ''رہے نام اللہ کا!'' سے خصوصی طور پر اخذ کر کے استفسار کیا ہے کہ میں جب روحانیت کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری کیا مراد ہوتی ہے؟ اور ان کا اصرار ہے کہ میں اس کا جواب کسی مضمون میں یا پھر یادوں کی کسی قسط میں ہی لکھ دوں۔یہ بیک وقت بہت ہی آسان اور بہت ہی مشکل سوال ہے۔سو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق مختصر ترین عرض کرتا ہوں کہ انسانی روح جب اپنے اصل مالک وخالق کی جستجو کا سفر کرتی ہے تو یہ سفر روحانیت کہلاتا ہے۔خالقِ کائنات روحِ اعظم ہے۔ہم سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔کسی کی وفات پر **انا للہ و انا الیہ راجعون** کہتے ہوئے ہم دراصل اسی حقیقت کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔

اُسی کے پاس تو جانا ہے لَوٹ کر آخر
سو خوب گھومئیے، پھریئے، رجوع سے پہلے

پیغمبرانِ الٰہی کی روحانیت ایک الگ مقام و مرتبہ ہے، اولیا و صوفیا کی روحانیت کے بھی اپنے اپنے مدارج ہیں۔ان سے ہٹ کر کوئی عام انسان اگر سچی لگن کے ساتھ خدا کی جستجو کرتا ہے، تو اس کی یہ جستجو ہی اس کی روحانیت ہے، اس میں وہ جتنی ترقی کرتا جائے گا، اتنا ہی روحانی طور پر آگے بڑھتا جائے گا۔

(میری کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے باب ''روح اور جسم'' سے اقتباس)

فہرست

میری دھرتی سے پرے کوئی بلاتا ہے مجھے
کہکشاؤں کی عجب راہ دکھاتا ہے مجھے

دنیا کو سمجھائیں کیسے، آخر کیسے سمجھے
باتیں اپنی سچی، سیدھی اور دنیا ہے گول
کب اپنی پہچان کے سارے بھید کھلے ہیں خود پر
جھانک ابھی کچھ اور بھی اندر، من کو اور ٹٹول

پیش لفظ۔1

مجھے اپنے ایک روحانی تجربے کی روداد بیان کرنی ہے لیکن اپنی روداد سے پہلے اپنے دادا جی اور ابا جی کے دو تجربوں کے بارے میں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلے میرے دادا جی کا تجربہ:

دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔سارے عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔دادا جی کو غسل دے دیا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے،ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ابا جی کو ”شادیٔ مرگ“ کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آ گیا۔دادا جی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً کہنے لگے دوسری گلی سے اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی فوت ہو گیا ہے۔۔دادا جی نے ایک انوکھی کہانی سنائی۔انہوں نے بتایا کہ مجھے دو سفید کپڑوں والے کہیں لئے جا رہے تھے کہ ایک مقام پر رُکنا پڑا۔وہاں موجود کچھ اور سفید کپڑوں والوں نے ایک رجسٹر چیک کیا(اسے عالم بالا کا شناختی کارڈ آفس سمجھ لیں)دادا جی کو لے جانے والوں کو، چیکنگ کرنے والوں نے کہا: باری تو اللہ رکھا کمہار کی تھی تم لوگ اللہ رکھا قریشی کو لے آئے ہو۔ چنانچہ غلطی معلوم ہو جانے کے بعد دادا جی کو پھر اس دنیا میں واپس لایا گیا اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کی موت واقع ہو گئی۔ جہاں تک اس واقعہ کی صحت کا تعلق ہے ابا جی، بابا جی، بوا حیات خاتوں۔۔سب نے یہ واقعہ اپنی چشم دید گواہی پر بیان کیا۔ چاچڑاں شریف اور کوٹ شہباز کے بعض دُور کے اور بوڑھے عزیزوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم بھاگ نکلنے والوں میں شامل تھے۔اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہ ندا کی دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں۔

(خاکوں کے مجموعہ ”میری محبتیں“ کے خاکہ ”ڈاچی والیا موڑ مہار وے“ سے اقتباس)

اور اب میرے ابا جی کا تجربہ:

۔۔۔۔۔۱۹۵۰ء میں ابا جی اچانک بیمار ہوئے تھے۔اس علالت میں عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔ بابا جی کے بیان کے مطابق ابا جی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر ابا جی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ ابا جی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا،اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ابا جی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہو گیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید(۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ابا جی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری، جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا، میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی، دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس ہوتا ہے۔واللہ اعلم! **(خاکوں کے مجموعہ ”میری محبتیں“ کے خاکہ ”برگد کا پیڑ“ سے اقتباس)**

دادا جی کا تجربہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ہے اور ابا جی کا تجربہ میری پیدائش سے سال بھر پہلے کا ہے۔ان دونوں تجربوں کے بارے میں سب سے زیادہ ابا جی سے معلومات ملیں اور مزید بابا جی(میرے تایا جی)،اور بوا حیات خاتوں سے بھی معلوم کیں۔یہ دونوں واقعات میں نے اپنے دونوں بزرگوں کے خاکوں میں لکھ دیئے تھے۔یہ خاکے 1986 سے 1990 کے دوران لکھے گئے اور میرے خاکوں کے مجموعہ ”میری محبتیں“ میں شامل ہیں۔جب میں یہ واقعات سن رہا تھا تب نہ تو میں نے ایسا سوچا تھا کہ کبھی انہیں لکھنے کی نوبت آئے گی اور نہ ہی ابا جی کے وہم و گمان میں تھا کہ میرے استفسار پر ان کا بیان کردہ یہ احوال کبھی باقاعدہ طور پر لکھ کر محفوظ کیا جائے گا۔ مجھے ایسا کرنے کی توفیق ملی ہے تو اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔

دادا جی اور ابا جی کے روحانی تجربوں کے بعد اب میں بھی ایسے ہی ایک تجربے سے گزرا ہوں۔اپنے تجربے کو میں دادا جی اور ابا جی کے تجربوں کا تسلسل سمجھتا ہوں۔انہیں کا ہی فیض سمجھتا ہوں کہ خدا نے ان کی وجہ سے مجھے بھی اس تجربے سے نوازا،اپنی محبت سے سرفراز کیا۔

جیسا کہ قارئین آگے چل کر پڑھ سکیں گے۔میرا تجربہ خواب نہیں جیتے جاگتے،پورے ہوش وحواس کے ساتھ تھا۔اگر اسے کشف کی کوئی نادر صورت مان لیں تب بھی مجھے اپنا جسم اس میں پوری طرح شریک دکھائی دیا۔میں ایک ہی وقت میں اپنے سارے بچوں کے ساتھ بھی بات کر رہا تھا اور دوسری دنیا میں بھی موجود تھا۔بچے میری کیفیت کو میرا آخری وقت شمار کر رہے تھے۔میں بھی پہلے یہی سمجھا تھا لیکن دوسری دنیا میں پھر جو کچھ ہوا وہ چار دنوں پر پھیلا ہوا ایک انوکھا روحانی تجربہ بن گیا۔

میں نے آئندہ صفحات میں بھی بار بار لکھا ہے کہ میں سائنس اور جدید میڈیکل ترقیات کا معترف ہوں۔یہاں بھی اعتراف کر رہا ہوں۔دماغی خلل کی جو قسمیں بتائی جاتی ہیں وہ بھی بڑی حد تک درست ہیں۔ان بیماریوں کے دوش بدوش روحانی تجربات کا بھی ایک سلسلہ ہے جسے واضح طور پر اور الگ طور پر دیکھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔جدید سائنس ابھی جہاں تک پہنچی ہے،اس سے آگے بھی ابھی بہت سارے جہان موجود ہیں۔بعض تک سائنس نے ابھی پہنچنا ہے اور بعض تک شاید پہنچ نہ سکے۔میرے ساتھ جو کچھ ہوا اور میں نے اس دوران جو کچھ کہا اور کیا اس کی مختصر سی اور محتاط (جی ابھی محتاط) روداد پیش کر رہا ہوں۔میرے تجربے کی شدت اتنی ہے کہ سارے بچوں کے ساتھ اسے شیئر کرنے کے باوجود میں اسے اپنے قارئین کے لئے بھی لکھنے پر مجبور ہوں۔شاید یہ میری پرانی عادت کا نتیجہ ہے کہ میں ایسے اسرار اور بھید اپنے تک نہیں رکھ پاتا۔مجھ میں انہیں سنبھال رکھنے کی ہمت نہیں ہے۔

میرا تجربہ،میرے دادا جی اور ابا جی کے تجربوں کا تسلسل ہے۔اس سلسلہ میں نعوذ باللہ نہ کوئی دعویٰ ہے اور نہ کسی سے کچھ منوانا ہے۔بس میری اوقات سے کہیں زیادہ مجھے ایک روحانی تجربہ نصیب ہوا اور میں نے چاہا کہ دلچسپی رکھنے والے دوست بھی اس میں شریک ہو سکیں۔

آپ میرے اس تجربے کے بارے میں جو بھی رائے قائم کریں،آپ کا حق ہے۔

حیدر قریشی۔جرمنی سے۔۔۔یکم اکتوبر 2020ء

پیش لفظ۔2

فروری 2020ء سے جنوری 2022ء تک میری بیماریوں اور صحت یابیوں کی روداد مکمل ہو چکی ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ای بک کی صورت میں اکتوبر 2020ء سے آن لائن موجود ہے۔

اب اکتوبر 2020ء سے 10 جنوری 2022ء کی روداد اس کتاب کے نئے اور آخری باب کے طور پر ''بیماری یا روحانی تجربہ'' میں بیان کر دی ہے،یوں اب تک کی یہ روداد مکمل ہو گئی ہے۔

اپنی یادوں کے 2009 اور 2010ء کے دو باب ''لبیک اللھم لبیک'' اور ''زندگی در زندگی'' بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے ہیں۔تب بھی مجھے موت کے حوالے سے ایک کیفیت سے گزرنا پڑا تھا۔ایسی کیفیات کے دوران موت کے تئیں میرا رویہ کیا ہوتا ہے؟اس کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ان ابواب میں بہت ساری دوسری یادیں بھی آ گئی ہیں۔یوں آپ دیکھ سکیں گے میں اپنی عام زندگی طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر کیسے بسر کرتا ہوں یا زندگی مجھے کیسے بسر کرتی ہے۔

ای بک کی صورت میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ریلیز ہونے کے بعد بعض عزیزوں،ادیبوں اور خاص احباب نے اپنے تاثرات اور تبصروں سے نوازا تھا۔اس ایڈیشن کے آخر میں ان تاثرات کا ایک انتخاب بھی شامل کر دیا ہے۔

دو سال کی یہ داستان اپنے آغاز اور انجام کے لحاظ سے شاید کسی ناول کی حیرت انگیز کہانی لگے،لیکن یہ سب کچھ سچ مچ مجھ پر گزر رہا ہے۔حقیقی زندگی کے بعض واقعات کسی بھی افسانے،ناول یا کہانی سے زیادہ حیرت انگیز ہوتے ہیں۔یہ کتاب پڑھ کر آپ بھی ایسا ہی محسوس کریں گے۔

حیدر قریشی۔جرمنی سے۔۔۔جنوری 2022ء

بیماریوں کا حال

اپنی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے باب ''علتیں، علالتیں'' میں، مَیں نے اپنی بعض ان بیماریوں کا ذکر کیا ہے جو مجھے پاکستان میں لاحق تھیں۔ جرمنی پہنچنے کے بعد غالباً 1996ء میں مجھے شوگر کی بیماری ہوئی۔ پھر 2009ء کے اکتوبر تک دل کی تکلیف ہوگئی۔ وقفے وقفے سے چار بار انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی۔۔۔ اور ایک بار صرف انجیو گرافی کرانا پڑی۔ بار بار سٹنٹ ڈالے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر سرجری کے لیے کہا لیکن اس بار میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا اوپن ہارٹ سرجری بے شک کر لیں لیکن مزید سٹنٹ بازی اب نہیں۔ پھر میں نے دل کے لیے ایک سیرپ کا دیسی نسخہ استعمال کرنا شروع کیا اور اب دس سال ہو چکے ہیں، دل کے معاملے میں خیریت ہی خیریت ہے۔ الحمدلِلہ۔ اس کا کافی سارا حال یادوں کے باب ''لبیک اللھم لبیک'' میں لکھ چکا ہوں۔ مبارکہ کی مسلسل اور سنگین بیماریوں کے دوران میرا زیادہ وقت ان کا خیال رکھنے میں گزر جاتا تھا۔ میرے صحت کے معاملات نارمل ہی تھے۔ 27 مئی 2019ء کو مبارکہ کی وفات کے بعد کے چند مہینے بجھے بجھے سے گزرے تاہم کوئی نئی بیماری نہیں ہوئی تھی۔

اب 17 فروری 2020ء سے 19 اگست 2020ء تک بیماریوں کی ایسی یلغار ہوئی کہ اس عرصہ کے دوران پانچ بار ایمبولینس بلانا پڑی اور ایک بار بیٹا خود ہسپتال لے کر گیا۔ عمر گزرنے کے ساتھ صحت کے مسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ میری بیماریاں بھی صرف اسی حد تک ہوتیں تو مجھے ان کا حال لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ تھوڑا بہت لکھنا پڑتا تو یادوں کے کسی نئے باب میں یا الگ مضمون میں کچھ ذکر کر دیتا۔ لیکن اس دوران چند دنوں پر محیط ایسا تجربہ ہوا کہ میرے لیے اس کو قدرے تفصیل سے لکھنا ضروری ہو گیا۔

پہلے مذکورہ بیماریوں کے سلسلہ میں بار بار ہسپتال جانے کا مختصر بیان۔۔۔

بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ 17 فروری کو طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ ایمبولینس بلانا پڑی۔ ایمبولینس والے Badsoden باڈزودن شہر کے ہسپتال میں لے گئے۔ مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ میرے بائیں گردے کو ٹیومر نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اگر گردے کو نکال دیا جائے تو جسم کے دیگر اعضاء تک ٹیومر نہیں پہنچ سکے گا۔ میں نے آپریشن کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تو 20 فروری کو مجھے ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ آپریشن کے لیے 27 فروری کی تاریخ طے ہوئی۔ گھر پہنچنے کے دو دن بعد ہی مجھے اپنا ہاتھ سُن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ بچوں کو بتایا تو انہوں نے پھر ایمبولینس بلا لی۔ پہلے باڈزودن والے ہسپتال لے جایا گیا ابتدائی تشخیص کے بعد وہاں سے Höechst ہوئیسٹ کلینک میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ہر طرح کے ضروری ٹیسٹ کرنے کے بعد مجھے فالج کے کسی امکانی حملے سے کلیئر قرار دے دیا گیا اور 26 فروری کو باڈزودن کے ہسپتال میں واپس بھیج دیا گیا، جہاں 27 فروری کو میرا بایاں گردہ نکالنا طے تھا۔

ہوئیسٹ کلینک کی ایک اہم بات یہ رہی کہ یہاں میرا MRT ٹیسٹ خیر و خوبی سے ہو گیا۔ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ چند سال پیشتر مجھے میرے ڈاکٹر نے دو بار اس ٹیسٹ کے لیے اسی کلینک میں بھیجا تھا لیکن میں نے باہوش و حواس اس ٹیسٹنگ تابوت میں جانے سے انکار کر دیا۔ دوسری بار مجھے نیند کی گولی دے کر ٹیسٹ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن میں جاگ رہا تھا سو پھر انکار کر دیا۔ یہ الگ بات کہ گھر جا کر چوبیس گھنٹے تک سوتا رہا۔ دراصل گولی دینے کے بعد میرے سو جانے کا انتظار کیا جانا چاہئیے تھا جو نہیں کیا گیا۔ اس بار جو پھر MRT کے لیے کہا گیا تو چھوٹا بیٹا ٹیپو (طارق) میرے پاس موجود تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے میرے اصل مسئلے کا بتایا تو طے ہوا کہ گولی دینے کے بعد مجھے نیند آنے تک انتظار کیا جائے گا اور تب تک ٹیپو بھی وہاں موجود رہے گا۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ ٹیپو نے جب تسلی کر لی کہ میں سو گیا ہوں تو تب میرا ایم آر ٹی ٹیسٹ کر لیا گیا۔ ویسے اس کے بعد فروری تا اگست دورانیہ کے ایک اور موقعہ پر جب باڈزودن میں میرا ایک اور ٹیسٹ طے پایا تو وہ لوگ ٹیپو کی موجودگی پر راضی نہ ہوئے اور مجھے نیند نہیں آئی۔ چنانچہ یہ ٹیسٹ بھی نہیں

ہونے دیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق 27 فروری کو میرے بائیں گردے کو آپریشن کر کے نکال دیا گیا۔ آپریشن کے بعد ٹیپو وہاں پہنچا تو میں بے ہوش تھا۔ڈاکٹر نے ٹیپو کو اجازت دی کہ وہ اندر جا کر مجھے دیکھ لے اور تھوڑی بہت بات بھی کر لے۔ٹیپو نے مجھ سے میری خیریت دریافت کی۔ایسے لگتا تھا جیسے ٹیپو کہیں دور سے بول رہا ہے۔میں نے مدھم سی آواز میں جواب دیا۔اسے تسلی ہو گئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ٹیومر 10.5 cm سائز کا تھا۔اس مرحلے سے گزرنے کے بعد گھر آ گیا۔

8 مارچ کو طبیعت پھر بگڑ گئی۔پھر ایمبولینس بلائی گئی۔اس بار انفلوئنزا اور نمونیہ دونوں کا اٹیک ہوا تھا۔جرمنی سمیت دنیا بھر میں کورونا زوروں پر تھا،ایسے وقت میں انفلوئنزا اور نمونیہ ہونے کے باوجود اللہ نے کورونا سے محفوظ رکھا۔دونوں بیماریوں سے ہفتہ بھر میں نجات مل گئی اور 16 مارچ کو پھر گھر واپس آ گیا۔

تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد بھوک نہ لگنے کا مسئلہ پھر تنگ کرنے لگا۔طبیعت بگڑنے لگی۔ 26 جون کو پھر ایمبولینس بلانا پڑی۔تشخیص میں کافی تگ ودو کے بعد معلوم ہوا کہ ٹیومر نے جگر کو بھی پچ کر لیا ہے۔تین جولائی کو کینسر کے ایکسپرٹ ڈاکٹر کے پاس بھیجتے ہوئے مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔اُس دن اسی لوکیشن میں ایک کنسلٹنٹ کے ساتھ بھی اپائنٹمنٹ تھی۔ٹیپو نے ہمت کر کے دونوں اپائنٹمنٹس کے اوقات میں ایڈجسٹمنٹ کی۔

ڈاکٹر نے کچھ بھی چھپائے بغیر بتایا کہ ہم دو تھراپیاں شروع کریں گے۔کیموتھراپی روزانہ ہوگی اور صبح شام ایک ایک گولی لینے کی صورت میں ہوگی۔گولی کا نام ہے Inlyta 5 mg ۔امیون تھراپی ڈرپ کے ذریعے ہوگی اور ہر 21 دن کے بعد ہوگی۔اس کے لیے طریق کار یہ ہے کہ میرے پہنچنے کے بعد پہلے میری طبیعت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔بالکل ٹھیک ہوں تو پھر ایک فرم کو امیون تھراپی کے لیے تازہ ڈرپ تیار کرنے کا فون کیا جاتا ہے۔بیس منٹ تک ڈرپ پہنچ جاتی ہے اور پھر بیس پچیس منٹ تک تھراپی مکمل ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر نے سب کچھ سمجھانے کے ساتھ یہ بتایا کہ دونوں تھراپیوں کا مجموعی خرچہ دس ہزار یورو ماہانہ ہے اور سارا خرچہ جرمنی کے میڈیکل سسٹم کے

مطابق ادا ہوگا اور یہ کہ اس میں مجھے خود سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔مزید یہ بھی کہ ڈرپ والی تھراپی کے لیے مجھے ہر بار ٹیکسی لینے آئے گی اور پھر گھر چھوڑ کر آئے گی۔اس کا خرچہ بھی یہاں کا میڈیکل سسٹم ادا کرے گا۔اس کے ساتھ ہی مجھے ایک سال کے لیے ٹیکسی کا لیٹر بنا کر دے دیا گیا جو مجھے ٹیکسی فرم کو جمع کرانا تھا۔سو تب ہی جمع کرا دیا تھا۔

پہلی امیون تھراپی کے لیے 6 جولائی کی تاریخ طے ہو گئی۔یہ سب جان کر دل اللہ کی شکر گزاری سے بھر گیا۔بار بار اللہ کا شکر ادا کیا۔پھر جرمن نظامِ حکومت کو دعا دی جس نے ہمیں کسی مطالبے کے بغیر اتنا کچھ دے دیا تھا۔جرمنی والو! آپ کا،آپ کے سسٹم کا شکریہ۔۔۔پاکستان میں ہوتے اور یہ صورتِ حال درپیش ہوتی تو ہم تو ایک تھراپی کا خرچہ بھی ادا کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

کنسلٹنٹ صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو وہ کینسر کے خطرات سے آگاہ کرنے کے ساتھ حوصلہ دینے لگیں۔کچھ اگلے جہان کی باتیں کیں۔یہ لوگ کینسر کے مریضوں کو امکانی صورتوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ نفسیاتی طور پر تسلی بھی دیتے ہیں اور ہمت بھی دلاتے ہیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے بڑے بیٹے شعیب کے گھر پہنچے،وہاں باقی بچے بھی پہنچ گئے تھے۔باقی کا سارا دن گہما گہمی رہی۔رات کو گھر پہنچے۔اگلے تین دن آرام سے گزر گئے۔اس دوران سارے عزیز واقارب اور خاص احباب کو درپیش صورتِ حال سے آگاہ رکھا ہوا تھا۔6 جولائی کو میری پہلی امیون تھراپی ہوئی۔6 اور 7 جولائی کی درمیانی شب عجیب ماجرا ہوا۔جدید ادب کی خان پور کے زمانے کی ایڈیٹر،معروف شاعرہ فرحت نواز نے مجھے سات جولائی کو دن میں واٹس ایپ کے ذریعے لکھا:

’’رات میں نے خواب دیکھا ہے،آپ مبارکہ کو مجھ سے ملوانے کے لئے لاتے ہیں۔بہت لمبی ڈارک براؤن یا بلیک چادر میں لپٹی ہوئی اور خاص طور پر منہ پر چادر کو نیچے تک لٹکا کر چہرہ چھپایا ہوا۔یہ واضح محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا سے چھپ رہی ہیں اور آپ کو بیماری میں تسلی دینے آئی ہیں۔ اپنے چہرے سے چادر اٹھا کر ملتی ہیں۔ہم دونوں میں جو باتیں ہوتی ہیں ان کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہاں میں ان کو تسلی دینے آئی ہوں۔موڈ خوشگوار ہوتا ہے۔ہنستی بھی ہیں۔پھر ہماری باتوں کے

دوران محسوس ہوتا ہے کہ وہ جانے لگی ہیں۔

میں کہتی ہوں ٹھیک ہے،ٹھیک ہے۔۔آپ وہاں خوش ہیں نا،

جنت میں مقام اونچا ہے نا۔۔۔۔ہنس کر کہتی ہیں ہاں ہاں۔۔پھر اپنے دونوں ہاتھ ملنے والے انداز میں سامنے پھیلا دیتی ہیں۔ہاتھوں کے درمیان تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے۔میں ان دونوں ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیتی ہوں اور کہتی ہوں،آپ نے اپنے میاں کے لئے دعا کرنی ہے۔

ہاں ہاں۔

میرے بچوں کے لئے بھی،میرے لئے بھی،

(ہنستے ہوئے) ہاں ہاں

ان سے گفتگو کے دوران ان کا چہرہ بھی چادر میں رہتا ہے۔میں چادر اٹھا کے ہی بات کرتی ہوں۔

اور ہم دونوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ دوسری دنیا سے آئی ہوئی ہیں۔ہمارے مل لینے کے بعد آپ لیٹی لپٹائی مبارکہ کو کندھے سے پکڑ کے پیچھے کو چل پڑتے ہیں،مجھے یہ کہہ کر کہ میں مبارکہ کو واپس چھوڑ آؤں۔

اور پھر میں نے آپ کو بہت فاصلے پہ اپنا شیونگ کِٹ اٹھاتے دیکھا۔

میں اسی جگہ کھڑی خواب میں ہی سوچ رہی ہوں کہ اب آپ نے ٹھیک ہو جانا ہے۔ان شاء اللہ۔

میری آنکھ کھلی تو سامنے کلاک پہ پورے تین بج رہے تھے۔‘‘

فرحت نواز کے اس خواب کے ساتھ عجیب بات یہ ہے کہ اسی رات اور جرمن وقت کے مطابق اڑھائی بجے (پاکستان کے ساڑھے پانچ بجے صبح) میں نے خواب دیکھا کہ پرانی اور بوسیدہ سی کسی عمارت میں ایک تنگ سے کوریڈور سے میں آگے جانا چاہتا ہوں لیکن ایک بدمعاش جو نہایت تگڑا اور لمبے قد کا ہے میرا رستہ روکے کھڑا ہے۔وہ مجھے مارنا چاہتا ہے یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور میں اس سے دل ہی دل میں ڈر بھی رہا ہوں۔پھر یکا یک نہ صرف وہ بدمعاش غائب ہو گیا بلکہ دیکھا کہ میں تنگ کوریڈور کی بجائے کسی عمارت کی کھلی چھت پر کھڑا ہوں۔وہیں سے ٹہلتے ہوئے میں ایک دوکان پر جاتا ہوں۔وہاں سے دو لڈو لیتا ہوں اور انہیں کھانے لگتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ دونوں خوابوں کی تعبیریں از خود ظاہر ہیں اور کینسر سے میری نجات اور شفایابی کی تسلی دیتی ہیں۔ہاں فرحت کے خواب میں میرے شیونگ کٹ اٹھانے سے میں نے یہ مراد لیا کہ زندگی معمول پر آ جائے گی۔باقی واللہ اعلم۔(ویسے زندگی معمول پر آ تو چکی ہے)۔

بے شک اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنے گنہگار اور کمزور بندوں کو ہر طرح سے تسلی دے دیتا ہے۔فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

پہلی امیون تھراپی 6 جولائی کو ہوئی۔اس کے بعد بیماری یا دوا کا کوئی ری ایکشن سامنے نہیں آیا۔ 15/16 جولائی کو مجھے ہچکی لگ گئی۔جب ہچکی رُکنے میں نہیں آئی تو 19 جولائی کو پھر ایمبولینس بلا لی۔ہسپتال میں جا کر مشکل یہ ہوئی کہ جب کوئی ڈاکٹر وزٹ پر آتا تو ہچکی بند ہو جاتی اور بعد میں پھر شروع ہو جاتی۔مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔آخر ایک الٹرا ساؤنڈ کے دوران لگاتار ہچکی شروع ہو گئی۔ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں اسے خاص اہمیت دی اور پھر اس کے علاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ایک گولی Baclofen تجویز کی گئی اور مفید ثابت ہوئی۔23 جولائی کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ٹیپو مجھے لینے آیا تھا۔یہاں سے ہم گھر جانے کی بجائے بڑی بیٹی رضوانہ کے گھر چلے گئے۔ وہاں باقی بچے بھی پہنچ گئے۔رات کافی دیر کو گھر پہنچے۔اگلے دن کچھ آرام کیا اور پھر آنے والے بچوں کو وزیر آغا کی ایک نظم سنائی۔لیکن 24 جولائی سے 31 جولائی تک کا احوال بعد میں۔۔۔ کیونکہ وہی تو اصل روداد ہے۔

یکم اگست سے پانچ اگست تک مجھے معمول سے زیادہ پیشاب آنے لگا اور میری تمام تر کوشش کے باوجود زیادہ تر سلوار میں ہی نکلنے لگا۔دوسری طرف قبض کی شکایت ہو گئی۔پانچ اگست کو شام تک پھر ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ایمبولینس والوں نے پہلے فوری چیک اپ کرنا شروع کیا۔ اتفاق سے میرا ٹمپریچر 38 سے کچھ اوپر نکلا۔عین اسی وقت مجھے عمر کے تقاضے والی کھانسی آ گئی۔ اب وہ لوگ کہنے لگے کہ باقی معاملات بھی دیکھتے ہیں لیکن پہلے کورونا ٹیسٹ ہوگا۔یک نہ شد دو شد۔اس بار ایمبولینس مجھے باڈ زودن شہر کے ہسپتال کی بجائے ہوئیسٹ کے ہسپتال میں لے گئی۔ وہاں کورونا کے ٹیسٹ کا فوری انتظام موجود تھا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے رات بھر میں ہی چیک کر

لیا گیا اور صبح کے ناشتے سے پہلے سٹیشن B-25 کے کمرہ نمبر 58 میں شفٹ کر دیا گیا۔ چند دنوں کے بعد کمرہ نمبر 52 میں بھیج دیا گیا۔ یہاں اب میں اکیلا نہیں تھا۔ ایک اور مریض بھی موجود تھا۔ ان دونوں کمروں کا کچھ حال آگے چل کر ''روحانی تجربے کے بعد تک اس کے اثرات'' میں بیان کروں گا کیونکہ اس کا تعلق بھی اس خاص تجربے سے ہے۔

یہاں یہ بتا دوں کہ 17 فروری سے لے کر 19 اگست تک متعدد ٹیسٹ لیے گئے۔ بعض ٹیسٹ مختلف اوقات میں ایک سے کئی بار زیادہ لیے گئے۔ اینڈوسکوپی، کولونوسکوپی، سونوگرافی، الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی سکین، ایم آر ٹی، ای سی جی، خون کے مختلف اور متعدد ٹیسٹ، اور نہ جانے کون کون سی گرافیاں اور سکوپیاں۔۔۔ گردے کے بعد لیور میں ٹیومر ملنے سے پھر دیگر اعضاء میں ٹیومر کی تلاش شروع کر دی گئی، اس سلسلے میں دل کے اندر کا حصہ تو ٹھیک تھا لیکن ایک چیک اپ ہوا جس میں دل اور اس کی شریانوں کے باہر کے حصہ کو بھی دیکھا گیا۔ وہ حصہ بھی صاف نکلا۔ اسی رات جن بھائی، بہنوں اور احباب نے اس ٹیسٹ کی بابت پوچھا میں نے ایک ہی جواب دیا۔ میرا دل اندر سے بھی ٹھیک تھا اور اب باہر سے بھی ٹھیک نکلا ہے۔ ثابت ہوا میرا دل اندر اور باہر سے ایک جیسا ہے۔

یورین انفیکشن کے سلسلہ میں تین ٹیسٹ ہوئے۔ یہ پہلے ہونے والے ٹیسٹوں سے مختلف تھے۔ ان کے نام بھی یاد نہیں۔ چھ اگست سے 19 اگست تک یورین انفیکشن کا علاج ہوتا رہا۔ دیگر میڈیسنز کے علاوہ چودہ دن تک تین وقت روزانہ اینٹی بایوٹک کی ڈرپیں لگتی رہیں۔ 19 اگست کو طبیعت سنبھلنے پر چھٹی دے دی گئی۔ چند دن کمزوری دور ہونے میں لگے اور پھر میں گھر کے اندر تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا پھر قریبی مارکیٹ تک جانے لگا اور اب قریبی قبرستان تک بھی آہستہ آہستہ سہی لیکن چکر لگا لیتا ہوں۔ وہاں مبارکہ کی قبر پر دعا کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

کیموتھراپی کی ٹیبلٹس تو میں خود ہی صبح شام لے لیتا ہوں۔ امیون تھراپی کے لیے ہر 21 دن کے بعد جانا ہوتا ہے۔ پہلی تھراپی 6 جولائی کو ہوئی، دوسری تھراپی 27 جولائی کو، تیسری تھراپی 17 اگست کو ہونی تھی لیکن چونکہ میں ہسپتال میں داخل تھا اس لیے ڈاکٹر نے فون کر کے تھراپی کے

لیے 27 اگست کی تاریخ لے لی۔ یہ تھراپی ہو گئی۔ چوتھی تھراپی 17 ستمبر کو ہوئی۔ اور ۔۔۔ یہ تھراپیوں کی گنتی اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کا حوالہ بھی آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ کینسر کا علاج اور تھراپیاں ابھی جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کامل شفا ملنے کی پوری امید ہے۔
ویسے جو اس کی مرضی!

راضی ہوں تیری مرضی پر لیکن بھید کھلے بھی
تیری مرضی کیا ہے یارا، کچھ تو کھل کر بول

خصوصی حال

اب 24 جولائی سے 31 جولائی تک کا خصوصی حال بیان کرتا ہوں۔پس منظر اور منظر دونوں کے ساتھ۔

میں نے اپنے جاننے والے مختلف لوگوں کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی اور خود بھی بعض لوگوں سے پوچھا جو کینسر کی بیماری میں مبتلا ہوئے اور پھر صحت یاب ہو گئے۔ان کا جرمنی، آسٹریلیا اور پاکستان سے تعلق ہے۔ان میں سے بیشتر نے اس سے ملتا جلتا حال بتایا کہ طبیعت میں بے چینی اور گھبراہٹ ہوتی تھی۔خوامخواہ غصہ بھی آتا تھا اور بعض مریض تشدد پر بھی اتر آتے تھے۔

کیا کسی کو کوئی ایسا تجربہ ہوا جسے روحانی تجربہ کہا جا سکے یا اس سے ملتا جلتا کوئی خوشگوار احساس ہو تو ایسی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ممکن ہے کہیں اور ایسے لوگ مل جائیں۔

6 جولائی کو پہلی تھراپی بالکل نارمل رہی۔ہچکی کی تکلیف ہوئی۔اس کے علاج کے بعد 25 جولائی تک سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ 23 جولائی کا دن میرے لیے دو تین وجہ سے خوشی کا دن تھا۔ہسپتال سے چھٹی ملی تھی۔یہ دن رضوانہ کا یوم ولادت تھا، اور اسی دن مجھے ڈاکٹر وسیم انجم صاحب کا فیس بک سے ایک تراشہ ملا تھا جس میں انہوں نے خبر دی تھی کہ نازیہ خلیل عباسی کا ''فرحت نواز کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ باضابطہ طور پر منظور کر لیا گیا ہے۔یہ میرے لیے بے حد خوشی کی خبر تھی۔''جدید ادب'' خان پور کے زمانے میں میرے خان پور کے تین خاص ادبی دوست ایک سال کے بعد ہی مجھے چھوڑ گئے تھے۔ان کا خیال تھا کہ میں ان کی وجہ سے کچھ مشہور (مشہور؟) ہونے لگا ہوں۔تب صرف فرحت نواز ہی تھیں جنھوں نے ''جدید ادب'' کے آخر دَم تک ساتھ نبھایا۔آج فرحت نواز پر ایم فل کا مقالہ منظور ہو گیا تھا جبکہ ساتھ چھوڑ جانے والے دوست جو سب صاحبِ حیثیت بھی تھے، ابھی تک اس اعزاز سے خالی ہیں۔خوشی کی اس

سے بھی اہم وجہ یہ تھی کہ 1980 میں کسی غیر ادبی بندے نے ایک بڑا بول بولا تھا۔آج اس کی تلافی ہو گئی تھی۔فرحت نواز نے تب ''ڈاکٹر وزیر آغا دیاں چونڑویاں نظماں'' کے نام سے 80 صفحات کی ایک مختصر سی اور غیر مجلد کتاب مرتب کی تھی۔اس میں وزیر آغا صاحب کی چند نظموں کا سرائیکی ترجمہ شائع کیا گیا تھا۔اس کتاب میں وزیر آغا صاحب کی ایک نظم ''ہوا اگر میرا روپ دھارے'' کا ترجمہ احمد پور شرقیہ کے معروف شاعر مظہر مسعود صاحب نے کیا تھا۔اس میں اردو نظم کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے آزاد ترجمہ کیا گیا تھا۔مجھے یہ ترجمہ اصل نظم سے زیادہ خوبصورت لگا تھا۔یہ چالیس سال پہلے (1980ء) کی بات ہے۔تب ایک ''زمین دار صاحب'' نے کتاب دیکھی تو بڑی حقارت سے کہا یہ کیا ہے؟ اسے آپ ادب کی خدمت سمجھتے ہیں؟

انھیں تو تب میں نے مناسب جواب دے دیا تھا لیکن ان کا حقارت آمیز لہجہ دیر تک دکھی کرتا رہا۔اب جو فرحت نواز پر لکھے گئے مقالہ میں ان کی مرتب کردہ کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا دیاں چونڑویاں نظماں'' کا بھی خاص ذکر ہوا ہے تو مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔میں نے ایک دوست کو لکھا ہے کہ ان ''زمیندار صاحب'' کو میری طرف سے یہ خبر بتا دیں اور ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ ایم فل کیا ہوتا ہے۔تو یوں میں بے حد خوش تھا۔

24 جولائی کو اسی لہر میں وزیر آغا صاحب کی نظم کا سرائیکی ترجمہ ''ہوا وٹا وے جے ویس میڈا'' پڑھنا شروع کر دیا۔پھر جو بچہ بھی ملنے آیا میں اسے یہ ترجمہ سنانے لگتا اور ساتھ بعض سرائیکی الفاظ کا مطلب بھی بتلاتا جاتا۔25 جولائی کو ٹیپو نے چھوٹی بیٹی مانو کے ہاں جانے کا پوچھا تو میں فوراً راضی ہو گیا۔اور بیٹی کو فون پر بتا دیا کہ میں نظم سنانے آ رہا ہوں۔چنانچہ اس کے گھر گئے اور یہ نظم سنائی۔

بیماریوں کے لگاتار حملوں کے باعث انتہائی نقاہت ہو گئی تھی۔یہ نظم پڑھتے ہوئے مجھے ہر بار ایسے لگتا کہ یہ نظم میری حالت اور کیفیات کو بیان کر رہی ہے۔موت کی علامت ہوا جب تک مجھ پر جارحانہ حملے کرتی رہے گی میں نہیں مروں گا لیکن اگر وہ میرے پاس محبت کے ساتھ آئے تو میں اپنا آپ ہار دوں گا اور ہنستے ہنستے جان دے دوں گا۔

مظہر مسعود صاحب کی ترجمہ کردہ نظم یہاں بھی درج کیے دیتا ہوں۔

ہوا اگر میرا روپ دھارے   از   ڈاکٹر وزیر آغا

سرائیکی ترجمہ: ہوا وٹاوے جے ویس میڈا از مظہر مسعود

ہوا حیران تھی ویندی اے جیند اڈیکھ تے میکوں
میڈے بُتھے بدن وچ پوڑ تے سانگاں اکھیندی اے
''تُوں ساہ حالی وی گھِندا پئیں؟''
ہوا کوں کیا ڈسانواں میں
جو میڈے ساہ تاں بس ہک وہم ہِن
ہُن ہک برابر ہِے میڈا ہوون تے نہ ہوون
ہزاراں کالیاں، سُکیاں، بُگھیاں جِلماں
میڈے بوتے کوں چنبڑ یاں پِن تے پیندیاں پِن لہو میڈا
بدن میڈا انجڑ داپئے، سُکڑ داپئے

میں کماندے سُکدے ون دا چھیکڑی بے رنگ پتّا ہاں
میڈا اتھر کاٹ میڈا ائیں
ہلارا خود ہوا داہِے
ہوا دا آپنا پھوکا میکوں آدے ہلا ڈیندے

میں
اکھی جے لیسواں پتھر ہاں
اندھے کھوہ دی گنی تے

ذری اٹکیا کھڑاں، ڈردا کھڑا ہاں
ہوا دے ہک اشارے نال ڈھیہ پوساں

ہوا کوں کیا ڈسانواں
میں سپاہی ہم جری کتنا، نڈر کتنا
مگر ساری دلیری اپنے اُتے آزما بیٹھاں
لہوا پنا وَنڈا بیٹھاں، کھنڈاں بیٹھاں
ایہ سب کجھ ہے مگر ول وی
میڈا رشتہ حیاتی نال قائم ہِے
میں اینویں مَر نہی سگدا،
میں اینویں ہَر نہی سگدا،
ایہ بئی گالھ اے
کیتھئیں بدلاں دے اولے تھی
وٹا تے ویس میں وانگے
ہوا میڈے کِنے آوے
ذری کھِل تے چا آکھے
''اَپنیاں دے نال وی کڈھ پا۔۔
بھلا اپنیاں کِنوں کیا ڈر؟''
تاں کھِل پوساں
میں اپنا آپ ہَر ویساں
میں کھِلدیں کھِلدیں مَر ویساں!

----

24 اور 25 جولائی کی درمیانی شب عجیب ماجرا ہوا۔رات کو جب بھی پیشاب کرنے کے لیے اُٹھتا،وضو کر کے باہر نکلتا اور کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے لگتا۔ مجھے تب بھی نہیں معلوم تھا،اب بھی معلوم نہیں کہ میں عشاء کی نماز پڑھ رہا تھا،تہجد پڑھ رہا تھا یا فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ہاں اتنا احساس تب بھی تھا کہ میں نماز پڑھتے پڑھتے کرسی پر ہی ہلکا سا لڑھکتا تھا اور پھر سنبھل جاتا تھا۔25 جولائی کا دن معمول کے مطابق گزر گیا۔ 26 جولائی کو دن میں گزشتہ شب کی نیند پوری کی۔اس دوران شام پانچ بجے کے قریب دوسرا بیٹا عثمان گھر میں آیا،اس نے مجھے آواز دی لیکن میں گہری نیند میں تھا۔چنانچہ وہ ڈرائنگ روم میں جا کر صوفہ پر سو گیا۔آٹھ بجے کے لگ بھگ میں پیشاب کے لیے ہڑبڑا کر اُٹھا تو کچھ لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔دیوار کو تھام کر باتھ روم تک گیا تو سلوار اتارتے اتارتے اس میں کچھ پیشاب نکل گیا تھا۔میں نے طہارت کی تو بہت سارا پانی باتھ روم کے فرش پر بہہ گیا،مزید یہ ہوا کہ لوٹا بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا،،سلوار کو وہیں چھوڑا اور شدید نقاہت کے باعث صرف قمیص کے ساتھ ہی اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔کافی دیر کے بعد نئی سلوار تبدیل کی۔اس دوران چھوٹی بیٹی درِثمین (مانو) نے مجھے فون کیا تو اس کے بقول میں نے اسے کہا کہ باتھ روم جاتے ہوئے میرا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔(یہ بات نہ مجھے یاد ہے اور نہ ہی عثمان نے یہ بات سنی۔نہ ہی میرے سر پر کسی طرح کی چوٹ کا نشان تھا،تاہم مانو نے سنا تھا تو درست سنا تھا)اس نے فوراً عثمان کو فون کیا کہ آپ کہاں ہیں؟ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔اس نے بتایا کہ میں ابو کے گھر میں ہی ہوں۔مانو کے بتانے پر عثمان میرے کمرے میں آیا۔تاہم تب تک حالت بہتر ہو چکی تھی۔عثمان کچھ دیر رُک کر پھر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔پھر کچھ دیر کے بعد ہی میں نے عثمان کو آواز دی۔وہ آیا تو اسے کہا کہ مانو اور رضوانہ کو فون کرو فوراً آ جائیں،پھر شعیب کو بھی یہی پیغام بھجوایا۔ٹیپو شام کو اپنے چند دوستوں کے ساتھ دو روزہ ٹرپ پر نکلا تھا۔چار گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔اسے بھی پیغام بھیجا کہ واپس آ جاؤ۔

مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ میں اب آخرت کے سفر پر جا رہا ہوں۔رضوانہ،شعیب، عثمان،درِثمین سب اپنے بیشتر بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ٹیپو کے دونوں بچے بھی پہنچ گئے۔ٹیپو رات

کو تین بجے پہنچ گیا۔سارے بچے اور بچوں کے بچے،بہو،داماد سب موجود تھے۔اب میرے پلنگ کے ارد گرد سارے بچے تھے۔پوتے،پوتیاں،نواسے،نواسی میں سے بعض تو میرے پلنگ پر آ گئے۔ایسی خوبصورت صورتِ حال میں تو بندہ ’’مُردن موقوف‘‘ کہہ کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔

میری ظاہری کیفیت دیکھ کر سارے بڑے بچے سہمے ہوئے تھے اور میں مسلسل مسکرا رہا تھا۔(ہنس نہیں رہا تھا،مسکرا رہا تھا)۔میں نے بچوں کو مخاطب کر کے کہا کہ دیکھو! میں کس طریقے سے دوسری دنیا میں جا رہا ہوں۔کیا کسی کو اس طرح مسکراتے ہوئے مرتے دیکھا ہے؟

موت کا رنگ برحق،مگر نہ موت کا خوف،نہ کوئی گھبراہٹ،نہ نزع کی تکلیف،بس ایک مسکراہٹ، لبیک الّٰھم لبیک۔۔۔آپ سب کو تو اس بات پر مطمئن ہونا چاہئے کہ ہمارا باپ اس انداز سے اپنے خدا کے پاس جا رہا ہے۔میں بچوں کو تسلی دینے کے لیے یہ باتیں کر رہا تھا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں نے زیادہ رونا شروع کر دیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میں عالمِ بالا میں پہنچ گیا ہوں۔میرا جسم بستر پر پڑا ہے مگر میں دوسری دنیا میں پہنچا ہوا ہوں۔میں وہیں سے بول رہا ہوں اور اپنے بچوں کو وہاں کا حال بتا رہا ہوں۔پہلے مرحلے میں یہ حال مختصراً بتایا تھا۔اس کے بعد میں نے،بستر پر پڑے ہوئے میں نے بالکل معصوم بچوں جیسی مسکراہٹ اور حیرت کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔

میں تو اپنے خدا سے بہت پیار کرتا ہوں لیکن مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرا پیارا خدا مجھے اتنا پیار کرتا ہے۔’’اتنا‘‘ کو میں بچوں کی طرح لمبا کر کے بے حد حیرانی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔میں نے یہ جملہ بار بار کہا اور پھر اللہ اکبر۔۔اللہ اکبر کا ورد شروع کر دیا۔اللہ اکبر کہتے ہوئے میں اپنے سینے پر ہاتھ مارتا تھا۔اللہ اکبر کے بعد میں نے سورۃ الم نشرح پڑھنا شروع کر دی۔اور بار بار پڑھتا رہا۔اس کی ان آیات کو پھر میں ایک سے زائد بار دہرانے لگتا۔

وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَک.فَاِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرَا.اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرَا.

یہ آیات پڑھتے ہوئے میں اپنے دونوں بازو اٹھا کر پھر گدے پر اس طرح مارتا تھا جیسے بچے صوفے پر یا بیڈ پر جمپنگ کرتے ہیں۔بچوں جیسی ہی خوشی تھی اور بچوں جیسی مسکراہٹ تھی۔

اس کیفیت کی اور بعد کی کیفیات کی جو باتیں لکھنے والی ہیں میں لکھ رہا ہوں۔بعض باتیں جو لکھنے والی نہیں ہیں میں نے بچوں کی مختلف جوڑیوں کو بتائی ہیں۔مثلاً کچھ باتیں رضوانہ اور درِثمین کو، کچھ باتیں ٹیپو اور رضوانہ کو، کچھ باتیں ٹیپو اور مانو کو۔پھر بعض باتیں صرف رضوانہ کو اور بعض باتیں صرف شعیب کو اور چند باتیں صرف عثمان کو۔ یہ باتیں بتاتے ہوئے میں نے انہیں کہا کہ یہ صرف آپ تک امانت ہیں۔ بعد میں بے شک خاندان کے دوسرے بچوں کو بھی بتا دیں لیکن صرف خاندان تک رکھیں۔ یہ کہہ کر میں نے بعض بچوں کو یہاں تک کہا کہ ان باتوں کو دوسروں تک پہنچانا ایسا ہی ہے جیسے میں ننگا ہو جاؤں۔ان باتوں کا پردہ بہت ضروری ہے۔ان باتوں کو سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن انہیں صرف خاندان کے لیے امانت سمجھیں۔سو مجھے ننگا مت کرنا۔اس کتاب میں ناگفتنی کے بارے میں اتنا لکھا ہی کافی سمجھا جائے۔

ان کیفیات کے دوران ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا ہوا کہ کوئی بچہ کسی دوسرے کو اشارتاً کچھ کہہ رہا ہے۔دوسرا بچہ سامنے ہوتے ہوئے بھی اشارا نہیں دیکھ رہا اور میں دوسری طرف منہ ہوتے ہوئے بھی وہ دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے اس بچے کو آواز دے کر کہا کہ وہ اتنی دیر سے اشارا کر رہی ہے اور آپ دیکھ ہی نہیں رہی ہیں۔رات بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔دونوں بیٹیاں گھر پر ہی رکی ہوئی تھیں۔ان کے بچے بھی موجود تھے۔کوئی دوسرے کمرے میں ہلکی سی سرگوشی بھی کرتا تو مجھے سنائی دیتی اور میں فوراً پوچھتا کہ فلاں نے کیا کہا ہے؟

ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے کمرے کی بیرونی کھڑکی کے پردوں کے پیچھے سے ایک خوشنما سا بندر جھانکتا ہوا اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہاتھ ہلاتا ہوا دکھائی دیا۔اس کے سامنے ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب بڑا سا کمبل جیسا کچھ پڑا ہوا تھا۔ یہ سب پُرکشش تھا لیکن میں نے فوراً اس طرف سے منہ پھیر لیا۔اس کے بعد ایک دو بار کنکھیوں سے اس طرف دیکھا کہ شاید وہ خوشنما بندر ابھی بھی وہیں موجود ہو۔لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔

رات کو کسی پل ہلکی نیند آئی تو بچوں نے بھی سونے کا ارادہ کر لیا۔تاہم دو بچے ہر وقت میرے کمرے میں رہتے۔ بیداری کے بعد پھر وہی خوشی کا اظہار کہ میرا خدا مجھے اتنا پیار کرتا

ہے۔پھر اللہ اکبر کا ورد اور سورۃ الم نشرح اور اس کی تین آیات کی دہرائی۔۔۔

پہلی تھراپی چھ جولائی کو ہوئی تھی اور ری ایکشن کے طور پر مجھے 26 جولائی کے دن تک کچھ نہیں ہوا۔اگلی تھراپی 27 جولائی کو تھی۔اپنے حساب سے میں فوت ہو چکا تھا اور اسی حالت میں بچوں سے باتیں کرتا رہا تھا۔بستر پر پڑا ہوا تھا اور دوسری دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔نیا دن چڑھتے ہی مجھے ساڑھے نو بجے تھراپی کے لیے روانہ ہونا تھا۔سو وقت پر ٹیکسی مجھے لے گئی اور تھراپی کے بعد وقت پر گھر پہنچا گئی۔واپسی پر میں نے ہلکا سا کھانا کھایا اور پھر گہری نیند سو گیا۔بعد میں چھوٹی بیٹی نے بتایا کہ آپ نے آتے ہی کہا تھا کہ پتہ نہیں میں کیسے یہاں تک پہنچا ہوں۔جبکہ مجھے یہ بات بالکل یاد نہیں ہے۔نیند سے بیدار ہوا تو پھر گزشتہ رات والی کیفیت تھی لیکن سفر اس سے آگے کا تھا۔

اب میں اگلی دنیا میں ایک اور سفر پر تھا۔آگے چل کر جب دادا جی کی وفات کے قصہ اور ابا جی کی موت جیسی علالت میں مقامات اور رفتار کے مسئلے پر بات کروں گا تب اپنے اس سفر کی رفتار کے بارے میں بھی بات کروں گا۔

کئی مناظر سے گزرتے ہوئے ایک وقت آیا جب مجھے کہا گیا کہ آپ نے اب آگے جانا ہے تو خدا سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن پھر واپسی ممکن نہ ہوگی۔لیکن اگر واپس جانا چاہیں تو یہاں سے بھی آپ کو خصوصی طور پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔میں نے یہ بات اسی وقت بچوں کو بتائی کہ مجھ سے میری مرضی پوچھی جا رہی ہے۔پھر میں نے وہاں جواب دیا کہ میری ذاتی خواہش تو یہی ہے کہ اپنے پیارے خدا سے مل سکوں لیکن بچوں کی جو حالت ہو رہی ہے اس کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے واپس چلا جاتا ہوں۔میرے جواب کے بعد کچھ دیر معاملے پر غور ہوا اور پھر بتایا گیا کہ مجھے واپس بھیجا جائے گا۔مزید کچھ دیر کے بعد میری واپسی کا حکم جاری کر دیا گیا۔میں تب ہی بچوں کو یہ سارا حال بتاتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے لیٹے ہوئے اپنا بایاں بازو دائیں طرف تکیے پر رکھنا چاہا تو وہاں تکیے کے اوپر صوفے کی ایک گدی پڑی تھی، ہاتھ اس گدی پر پڑا۔کچھ دیر کے بعد اس گدی میں ہوا بھرنی شروع ہو گئی۔میں نے قریب کھڑی چھوٹی بیٹی سے کہا گدی کو ہاتھ لگاؤ۔اس میں ہوا بھر رہی

ہے، یہ اس بات کا اشارا ہے کہ میری روح واپس آ رہی ہے۔ بیٹی نے گدی کو ہاتھ لگا کر کہا مجھے تو بالکل نہیں محسوس ہو رہی۔ میں نے کہا ہاں یہ میرے لیے اشارا ہے۔ پھر میں نے بائیں کروٹ ہو کر دائیں ہاتھ سے بیڈ کے گدے کو مضبوطی سے پکڑا تو پورے گدے میں ہوا بھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔تب میں نے زیادہ بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا کہ زندگی کی واپسی ہو گئی ہے، روح واپس آ گئی ہے۔ مجھے مزید کچھ جینے کے لیے واپس بھیج دیا گیا ہے۔اور پھر وہی اللہ کے پیار کا بیان، اللہ اکبر کا وِرد اور سورۃ الم نشرح اور پھر اس کی تین آیات کی بطور خاص دہرائی۔۔۔والا حال۔

بچے رو رو کر تھک چکے تھے۔ میری طرف سے زندگی کی واپسی کے اعلان کے بعد بچے اب کچھ حوصلے میں آ گئے تھے۔ بعض بچوں کے ذہنوں میں کچھ سوال تھے۔انہوں نے وہ سوالات کیے۔مقصد یہ تھا کہ میں جو کچھ بیان کر رہا تھا اس کی مزید کچھ وضاحت ہو جائے۔ بعض بچے سائنٹفک ذہن رکھتے تھے انہوں نے اپنے طریق سے سوال کیے۔ان کے ساتھ سوال جواب بحث کی صورت بھی اختیار کر گئے۔ یہاں میں بچوں کے نام دے کر سوال پیش کرنے کی بجائے ان کے سوالات ہی لکھوں گا اور پھر اپنی سمجھ بُوجھ کے مطابق ان کے جواب بھی لکھوں گا۔ یہ زیادہ تر جواب میں نے تب ہی بچوں کو دے دیئے تھے۔

ایک بار پھر یہ واضح کر دوں کہ میں سائنس اور جدید میڈیکل سائنس کی برکات کا قائل ہوں اور ان کی اہمیت کو جانتا اور مانتا ہوں۔ یہ علوم جو کچھ بتاتے ہیں ایک حد تک بالکل درست ہیں۔لیکن میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان علوم سے آگے بھی بہت سارے جہان ہیں جن تک یہ علوم ابھی پہنچ نہیں سکے۔

ہمارے معاشرے میں ہسٹیریا کے مریضوں میں سے لڑکیوں کی حالت دیکھ کر ان پر کسی جن کے سائے یا کسی آسیب کی بات کی جاتی ہے اور مردوں میں اسے پاگل پن، جنون میں شمار کیا جاتا ہے۔جبکہ یہ ایک بیماری ہے جس کا اب بہتر علاج ہو جاتا ہے۔

انسانی نفسیات میں کہیں کچھ گڑ بڑ ہو تو یہاں بھی بہت کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا ہے۔تاہم ان میں عمومی طور پر خاندانی پس منظر اور مریض کی ذاتی زندگی سے بہت کچھ دریافت کیا جا سکتا ہے اور

اس کا بہتر علاج کیا جا سکتا ہے۔

دیوانگی کو ہسٹیریا سے الگ کرتے ہوئے میں اس کی دو اہم کیفیات کا ذکر کروں گا۔ دیوانگی کی ایک کیفیت میں انسان کسی ایک مقام پر رُکا ہوا ہوتا ہے، اور اس سے آگے نہیں جا پاتا۔ دوسری کیفیت وہ ہے جس میں انسان اپنے وقت سے آگے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ سائنس کسی ایک مقام پر رُکے ہوئے انسان کو تو کچھ رواں کر سکتی ہے لیکن اپنے وقت سے آگے نکل جانے والے کو واپس لانا ابھی تک ممکن نہیں ہوا۔

دواؤں کا ردِ عمل۔۔۔مختلف بیماریوں کے اثرات کے نتیجے میں بھی اور بعض دواؤں کے اثرات کے نتیجے میں بھی انسان کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ کینسر کی تھراپیوں کا ری ایکشن تو کافی سخت رہتا ہے۔جیسا کہ شروع میں ذکر کر آیا ہوں کہ مریض پر گھبراہٹ طاری ہوتی ہے، شدید بے چینی ہوتی ہے، غم وغصہ کی حالت ہوتی ہے۔اس حد تک کہ بعض اوقات وہ مضطرب ہو کر تشدد پر بھی اتر آتا ہے۔

میں اپنے آپ کو ان ساری بیماریوں اور ان کے اثرات کے حوالے سے دیکھتا ہوں تو ابھی تک اللہ کے فضل و کرم سے ان سب سے محفوظ ہوں۔ کینسر کی تھراپیوں کے ری ایکشن کو اگر میرے تجربے کا سبب کہا جائے تو میرا بڑا سیدھا اور سائنسی نوعیت کا سوال ہے کہ کیا کینسر کے کسی مریض کو صدمے کے معلوم شدہ ری ایکشن سے ہٹ کر کبھی ایسا ری ایکشن بھی ہوا جیسا مجھے تجربہ ہوا؟ یا کوئی اور مگر نہایت خوشگوار کیفیت اس پر طاری ہوئی؟۔اس سلسلے میں کوئی ''سٹوری'' نہیں بلکہ آج کے ہزاروں مریضوں میں سے کوئی ایک مثال لائی جائے۔

اب میں سائنسی ذہن رکھنے والے اپنے بچوں کے لیے اپنے تجربے کا ایک عقلی جواز پیش کرتا ہوں۔انسانی دماغ کی کارکردگی کو دیکھا جائے تو یہ بھی اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔صرف سائنس پر تکیہ کرنے والے احباب بخوبی جانتے ہیں کہ ہزاروں برسوں سے ترقی پذیر انسان جو پتھر کے زمانے سے آج کمپیوٹر کے زمانے تک آن پہنچا ہے، یہ سب اس کے دس سے پندرہ فی صد دماغ کی کارکردگی کا ثمر ہے۔دماغ کا باقی کا جو 85 یا 90 فی صد حصہ خاموش پڑا

ہے،اگر وہ بھی انسانی دسترس میں کام کرنے لگے تو مزید اور بے پناہ انسانی ترقیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

میرا موقف یہ ہے کہ دماغ کا خاموش حصہ کبھی کبھار کوئی لشکارا سا آگے بھیج دیتا ہے جسے علوم کی دنیا میں کبھی کوئی بڑا انکشاف بھی کہا جاتا ہے، جسے کبھی کوئی روحانی تجربہ بھی کہا جا سکتا ہے۔کیونکہ دماغ کا کمپیوٹر کہیں کسی آسمانی سپریم کمپیوٹر سے بھی جڑا ہوا ہے۔جدید میڈیکل سائنس خود دماغ کی کارکردگی کو ابھی پوری طرح نہیں جان سکی۔یہ حقیقت خود میڈیکل سائنس والے بخوبی جانتے ہیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ اگر فوت ہو گئے تھے تو باتیں کیسے کر رہے تھے اور تھراپی کے لیے بھی کیسے چلے گئے تھے؟

اس کا جواب یہ تھا کہ روحانی تجربے کو جاننے کے لیے اُس دنیا سے کچھ شناسائی ضروری ہے۔تاہم یہ معاملہ تو سائنسی طور پر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔اُردن کے موجودہ شاہ عبداللہ کے والد شاہ حسین امریکہ میں تھے۔وہیں ان کی وفات ہوگئی۔کلینیکل موت ڈیکلئیر کر دی گئی لیکن کسی خاص طبی عمل سے وہ پورے پروٹوکول کے ساتھ چلتے ہوئے ائر پورٹ تک گئے، جہاز میں سوار ہوئے اور اپنے وطن پہنچے، حالانکہ ان کی وفات ہو چکی تھی۔سو اگر مادی دنیا میں سائنسی طور پر ایسا کچھ ہو سکتا ہے تو خدا کے لیے کسی بندے کے واسطے ایسا کچھ کر دینا کون سا مشکل کام ہے کہ وہ فوت بھی ہو گیا ہے اور چل پھر بھی رہا ہے اور بات بھی کر رہا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ ایک ہی وقت میں اُس دنیا میں بھی ہیں اور اِس دنیا میں بھی ہیں۔اور بیک وقت دونوں مقامات پر بات کر رہے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ تھا کہ عام خواب میں بھی انسان ایک ہی وقت میں بستر پر لیٹا ہوتا ہے اور خواب میں کہیں سے کہیں پہنچا ہوتا ہے۔جبکہ یہ تجربہ خواب سے اوپر کا تھا۔شاید کشف کی ایسی نادر صورت تھی جس میں جسم بھی کسی نہ کسی طور شریک تھا۔

مجھ سے سوال نہیں کیا گیا بلکہ وضاحتاً مجھے یہ بات بتائی گئی کہ ہپناٹزم کے ذریعے انسان

کو اگلی دنیا کے No Mans Land ایریا میں بھیجا جا سکتا ہے اور وہاں سے دنیا میں واپسی بھی ہو جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہپناٹزم کے ماہرین کسی کو اگلی دنیا کے کسی بھی زون میں نہیں بھیج سکتے۔ہاں کسی انسان کو ٹرانس میں لا کر اسے اس کے ماضی کی دنیا کا کچھ حال دکھا سکتے ہیں۔اس سے بھی انسان کا کتھارسس کر کے اس کے بعض ڈر اور نفسیاتی مسائل دور کیے جا سکتے ہیں۔میں نے اس سلسلہ میں دس سال پہلے کچھ لکھا تھا، وہ لکھا ہوا یہاں درج کر دیتا ہوں، اس سے اس مسئلہ پر میرا موقف کافی وضاحت کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔

’’پاکستان اور انڈیا کے کئی چینلز جرمنی میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ایسے ہی چینلز میں ایک کا نام NDTV Imagine ہے۔گزشتہ برس اس چینل پر ایک رئیلیٹی شو’راز پچھلے جنم کا‘‘ کے نام سے دکھایا گیا۔چند محدود قسطوں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔میرے گھر والے اس شو میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ شاید انہیں یہ اپنے معتقدات کے خلاف لگتا تھا۔میرے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ایک تو یہ کہ میں ایک طویل عرصے سے کبھی ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی پچھلے جنم میں بادشاہ/راجہ یا سردار قسم کی چیز تھا اور کبھی ایسے لگتا ہے کہ میں کوئی سادھو، سنت، فقیر یا ملنگ تھا۔میں اس بات کو اپنی بیوی کے علاوہ بعض بچوں کے ساتھ بھی بیان کر چکا ہوں۔یہ دو مختلف دھاروں کا احساس پاکستان میں قیام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔اس لیے پچھلے جنم کا اسرار میرے لیے ذاتی دلچسپی کا موجب تھا۔دوسری بات یہ کہ مجھے روح کے بھید کو سمجھنے کی خواہش ہمیشہ سے رہی ہے۔یہ گیان اور معرفت مجھے کہیں سے بھی ملنے کی امید ہو میں ممکنہ حد تک وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔یہ شو تو گھر بیٹھے ہی دستیاب ہو رہا تھا۔اس میں ایک ماہرِ نفسیات خاتون ایک خصوصی نوعیت کے بیڈ کے ساتھ براجمان ہوتی تھیں۔وہاں اپنے پچھلے جنم کی یاترا پر جانے کے خواہشمند کو لٹا کر پچھلے جنم کا کچھ حصہ دکھایا جاتا تھا۔میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ مسمریزم سے ملتے جلتے کسی نفسیاتی طریقے سے مریض کو ٹرانس میں لا کر پھر کسی جینیٹک وے سے یا صدیوں سے محفوظ لاشعور کے ذریعے ہمارے آباؤاجداد کے کسی کردار کی فلم کے ذریعے سے نفسیاتی علاج کر دیا جاتا

ہے۔

اس شو میں آنے والے بعض لوگ اپنے پچھلے جنم کی کئی انوکھی داستانیں سنا رہے تھے۔میں ان سب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔یہ تو سائنس کی ایک سادہ سی، درسی نوعیت کی عام سی بات ہے کہ ہر انسانی سیل کے نیوکلس میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔۲۳ ماں کی طرف سے اور ۲۳ باپ کی طرف سے۔کروموزوم کے اندر ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے DNA کہتے ہیں۔اس DNA کے مالیکیول کے مخصوص حصوں کو جین کہتے ہیں۔سیل کے ہر فعل کو کنٹرول کرنے والی ایک مخصوص جین ہوتی ہے۔انسانی جسم کے اربوں سیل میں سے ہر ایک سیل کے ۴۶ کروموزوموں کو ملا کر کروڑوں کی تعداد میں جینز ہوتی ہیں۔ایک سیل جس کے اندر یہ کروڑوں کی سرگرمیاں جاری و ساری ہیں،اس کی مادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ سوئی کی نوک پر ۲۰ ہزار سیل سما جاتے ہیں۔(یہاں مجھے ایک غیر متعلق بات یاد آ گئی۔بغداد پر ہلاکو خان کے حملہ کے وقت علماء کے دو گروہوں میں اس مسئلہ پر مناظرہ ہو رہا تھا کہ ستر ہزار فرشتے سوئی کے ناکے میں سے گزر سکتے ہیں یا نہیں؟۔سوئی کی نوک پر مادی صورت کے حامل ۲۰ ہزار سیل سما سکتے ہیں جبکہ ہر سیل کے اندر کروڑوں جینز موجود ہیں،تو ناکے میں سے ستر ہزار فرشتوں کا گزرنا تو معمولی سی بات لگتا ہے)۔

سیل کی کارکردگی کی اس تفصیل کے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمارے اندر ہمارے آباؤاجداد کی عادات وافعال کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے۔ان کے ذریعے ہمارے ننھیال، ددھیال کے اعمال وعادات کا بہت سارا حصہ ہم میں منتقل ہو جاتا ہے۔اپنے آپ کو کبھی کوئی مہاراجہ یا سردار اور کبھی کوئی ملنگ فقیر محسوس کرنا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے ددھیال، ننھیال میں سے کوئی ایسے رہے ہوں گے اور انہیں کی وہ بادشاہی اور فقیری میرے اندر بھی سرایت کر کے کسی نہ کسی رنگ میں میرے مزاج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

این ڈی ٹی وی پر پچھلے جنم کا جو سفر میں دیکھ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ اصل میں ان کے کروموزوم میں محفوظ آباؤاجداد کے کسی کردار کی زندگی کی کوئی پرچھائیں جیسی جھلک تھی۔یہ میں ان افراد کے

بارے میں لکھ رہا ہوں جن کی داستانوں میں کہیں کوئی ربط تھا۔لیکن کئی باتیں بے ربط یا بے جوڑ بھی محسوس ہوئیں۔مثلاً کسی کو شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے تو اس کے پچھلے جنم میں اسے کسی صندوق میں بند کر کے ڈبو دیا گیا تھا۔پچھلے جنم میں ظلم ہوا تھا تو اب تو اس کے بدلہ میں من میں شانتی اور کھلے پن کا احساس ہونا چاہیے تھا۔اگر وہی گھٹن کا احساس ابھی تک موجود ہے تو پھر نیا جنم پچھلے جنم کا اجر نہیں بنتا بلکہ اسی سزا کا تسلسل لگتا ہے جس کے نتیجہ میں پچھلا جنم انجام کو پہنچا۔تاہم میرا مقصد یہاں ہرگز ہرگز کسی کے عقائد پر اعتراض کرنا نہیں ہے بس اس پروگرام کو دیکھتے وقت روح کی کھوج کی میری لگن جو کچھ سجھاتی رہی وہ بیان کر رہا ہوں۔بعض پروگراموں میں جو کچھ دکھایا گیا انہیں کے اندر پچھلے جنم کی داستان کی تردید ہو گئی۔مثلاً ایک لڑکی کے پچھلے جنم میں اس کی ساس نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔وہ اپنے پچھلے جنم کے گھر کے علاقہ اور ہاؤس نمبر سے لے کر اسکول کے نام پتہ تک کی ساری تفصیل بیان کرتی ہے۔لڑکی کا پچھلا جنم بھی دہلی میں ہوا اور موجودہ جنم بھی دہلی میں ہوا۔لیکن جب پچھلے جنم کے مقامات کی تصدیق کرنے گئے تو کوئی بھی درست ثابت نہ ہوا۔اسی طرح انڈیا میں پنجابی فلموں کی ایک اداکارہ پچھلے جنم میں یاسمین خان تھی،سلطان نامی مسلمان سے محبت کرتی تھی۔رنجیت سنگھ کے مزار پر جھاڑو دیا کرتی تھی۔۱۹۴۷ء میں اسے مسلمانوں نے قتل کر دیا۔کسی مسلمان کو کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں قتل ہوتا بتایا جاتا تو قابلِ فہم بات ہوتی یا پھر لڑکی ہندو یا سکھ ہوتی اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں ماری جاتی تو پچھلے جنم کا راز سمجھ میں بھی آتا۔اس طرح کے کئی بے جوڑ نتائج پر مبنی پروگرام ماہرِ نفسیات خاتون کی تشخیص کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔''

(''کھٹی میٹھی یادیں'' کے باب ''زندگی در زندگی'' سے اقتباس)

دادا جی اور ابا جی کے تجربے، کچھ وضاحت

پیش لفظ میں دادا جی اور ابا جی کے تجربوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ انہیں ایک بار پھر یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ میں ان دونوں تجربوں کو ایک تسلسل میں دیکھتا ہوں۔

”دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ سارے عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔ دادا جی کو غسل دے دیا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے، ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ ابا جی کو ”شادیٔ مرگ“ کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آ گیا۔ دادا جی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً کہنے لگے دوسری گلی سے اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔ وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی فوت ہو گیا ہے۔۔

دادا جی نے ایک انوکھی کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے دو سفید کپڑوں والے کہیں لئے جا رہے تھے کہ ایک مقام پر رُکنا پڑا۔ وہاں موجود کچھ اور سفید کپڑوں والوں نے ایک رجسٹر چیک کیا (اسے عالم بالا کا شناختی کارڈ آفس سمجھ لیں) دادا جی کو لے جانے والوں کو، چیکنگ کرنے والوں نے کہا: باری تو اللہ رکھا کمہار کی تھی تم لوگ اللہ رکھا قریشی کو لے آئے ہو۔ چنانچہ غلطی معلوم ہو جانے کے بعد دادا جی کو پھر اس دنیا میں واپس لایا گیا اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کی موت واقع ہو گئی۔ جہاں تک اس واقعہ کی صحت کا تعلق ہے ابا جی، بابا جی، بوا حیات خاتوں۔۔ سب نے یہ واقعہ اپنی چشم دید گواہی پر بیان کیا۔ چاچڑاں شریف اور کوٹ شہباز کے بعض دُور کے اور بوڑھے عزیزوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم بھاگ نکلنے والوں میں شامل تھے۔ اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہ ندا کی دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے

سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں۔“

(خاکوں کے مجموعہ ”میری محبتیں“ کے خاکہ ”ڈاچی والیا موڑ مہار وے“ سے اقتباس)

دادا جی جس مقام تک گئے اب مجھے اس کے لئے No Mans Land کے الفاظ مناسب لگ رہے ہیں۔ اس مقام تک بے شمار لوگ گئے، کچھ آگے نکل گئے اور کئی واپس بھی آ گئے جیسے میرے دادا جی۔

دادا جی کے بعد اب ابا جی کا تجربہ۔۔

”۱۹۵۰ء میں ابا جی اچانک بیمار ہوئے تھے۔ اس علالت میں عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔ بابا جی کے بیان کے مطابق ابا جی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر ابا جی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ ابا جی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا، اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔ اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔

ابا جی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہو گیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید (۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ ابا جی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری، جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا، میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی، دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!“

(خاکوں کے مجموعہ ”میری محبتیں“ کے خاکہ ”برگد کا پیڑ“ سے اقتباس)

ابا جی کا تجربہ خواب اور کشف کی کوئی ارفع صورت تھا جس میں جان نکل رہی ہے اور وہ سبز رنگ کے فانوس کی روشنی میں بہت سارے بزرگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ سبز روشنی کے

ذریعےمختلف زمانوں کے مختلف بزرگوں سے ملاقات دراصل روشنی کی رفتار سے ایک روحانی سفر تھا۔ مجھے اس حقیقت کو سمجھنے میں اب کوئی مشکل نہیں ہے۔

دادا جی اور ابا جی کے تجربوں کے تسلسل میں پھر مجھے ایسا تجربہ نصیب ہوا۔ میں بستر پر پڑے ہوئے عالمِ بالا سے بول رہا تھا۔ وہاں کا حال اور یہاں کا حال ایک ساتھ بیان کر رہا تھا۔ یہ بظاہر کسی مریض کی ذہنی کیفیت کہی جاسکتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ اپنے تجربہ میں پورے ہوش وحواس کے ساتھ میں اپنا سفر کر رہا تھا۔ میرے بچے اور بچوں کے بچے میرے اردگرد موجود تھے اور میں اس سارے تجربے سے گزر رہا تھا۔ اور اب اپنی حیثیت سے بلکہ اپنی اوقات سے بڑھ کر بہت بڑی بات لکھنے لگا ہوں کہ میں روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے نتیجہ میں مجھ پر سنہری رنگ کے ذرات ویسے ہی پڑ رہے تھے جیسے پاکستان میں بس یا ٹرین کے سفر میں مٹی کے ذرات پڑتے ہیں۔ میں ان سنہری ذرات کو اپنی ہتھیلیوں پر بہت زیادہ محسوس کر رہا تھا اور اپنی انگلیوں کو ہتھیلیوں پر لگانے سے عجیب سی لذت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بچوں سے بھی کہا کہ میری ہتھیلیوں کا رنگ دیکھو اور ان پر اپنی انگلیاں پھیر کر دیکھو۔

ان باتوں کے بعد آپ میری دماغی حالت پر پوری طرح شک کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کیا کروں، جو کچھ پیش آیا میں ویسے ہی بیان کر رہا ہوں اور ابھی کم بیان کر رہا ہوں۔

میں جدید سائنس کا معترف ہوں، اس کی برکات و فیوض کو مانتا ہوں۔ اب تک سائنس جہاں پہنچی ہے بہت بڑی بات ہے لیکن ابھی بہت سے مقامات ہیں جہاں سائنس نے آگے چل کر پہنچنا ہے، جدید سائنس والوں سے پوچھئے۔۔۔۔

اگر روشنی کی رفتار سے بھی تیز رفتار کے مختلف مدارج سے سفر کیا جائے تو سفر شروع کرنے سے پہلے منزل آجاتی ہے۔

یہ واقعہ ہوا اپنے وقوع سے پہلے
کہ اختتامِ سفر تھا شروع سے پہلے

29 جولائی کو میرے داماد عادل کے ہاں ایک تقریب تھی۔ بیٹی نے کہا کہ اس حالت میں تو

آپ شاید تقریب میں نہیں جانا چاہیں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس لئے جانا چاہوں گا کہ وہاں پر مجھے شریک دیکھ کر آپ مزید اندازہ کر سکیں کہ میں کتنا ہوش میں ہوں۔ چنانچہ اس تقریب میں شریک ہوا۔ ہال کے ساتھ کوریڈورز تھے۔ میں بڑے بیٹے شعیب کو ساتھ لے کر ان کوریڈورز میں گھومتا پھرتا رہا۔ ایک مقام پر رُک کر شعیب کے ساتھ راز کی چند باتیں کیں۔ باتیں شاید زیادہ نہیں تھیں لیکن وقت زیادہ لگ گیا۔ ہاں یہ باتیں ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کی تھیں۔ یہ آرائشی آئینہ تھا جسے ہال میں داخلے سے پہلے سجاوٹ کے طور پر لگایا گیا تھا۔ ہم دونوں آئینے کے روبرو تھے۔ ایک موقعہ پر میں نے شعیب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے کچھ زیادہ خاص باتیں بھی کیں۔

اس تقریب میں موسیقی کا شور بہت زیادہ تھا۔ اگر میرے زمانے کے یا میرے مزاج کے گانے ہوتے تو کچھ دیر اور بیٹھ جاتا۔ موسیقی کے بے ہنگم شور سے تھک کر میں بڑے بیٹے کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ وہاں شور نہیں تھا تو سر میں ہتھوڑی سی چلنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے شعیب سے کہا کہ میرے سر کے اس طرف کان لگاؤ، کچھ سنائی دیتا ہے؟

شعیب نے کافی کوشش کی لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ کچھ دیر کے لئے خاموشی اور سکون سا محسوس ہوتا لیکن کچھ دیر کے بعد پھر وہی ٹک ٹک شروع ہو جاتی۔ اپنے گھر جانے کے بعد قدرے افاقہ ہوا۔ دوسرے دن مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلے چار دن سے مسلسل بولنے کی وجہ سے بھی کچھ اثر ہوا ہوگا اور پھر رات کی تقریب میں موسیقی کے بے تحاشا شور نے زیادہ اثر کیا اور دماغ میں ہتھوڑی سی چلتی رہی۔

میرا جو بھی تجربہ ہے اگر اس کی روحانی نوعیت ہے تو یہ میرے دادا جی اور ابا جی کے تجربوں کا ہی تسلسل ہے۔ دادا جی جب فوت ہوئے تو دنیا سے بالکل کٹ گئے اور اگلی دنیا کا حال دیکھتے رہے۔ موت سے واپسی پر پھر انہوں نے وہاں کا حال بتایا۔

ابا جی جب اپنے تجربہ سے دوچار ہوئے تو وہ دونوں دنیاؤں سے جڑے ہوئے تھے لیکن باہر کا حال بابا جی اور ان کے شاگرد دیکھ رہے تھے اور ابا جی اس سے بے خبر تھے۔ اور ابا جی

اندر یا دوسری دنیا کا جو حال دیکھ رہے تھے بابا جی اور ان کے شاگرد اُس حال سے بے خبر تھے۔

اب مجھے جو روحانی تجربہ ہوا ہے اس میں نہ صرف میں دونوں دنیاؤں سے منسلک تھا بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں طرف ہم کلام تھا۔ اِس دنیا میں میرے اپنے سارے چھوٹے بڑے بچے اس تجربے کے گواہ بن رہے تھے۔ میں نے شروع میں بھی کچھ لکھا تھا اب پھر لکھ رہا ہوں کہ میرا روحانی تجربہ کشف کی عمومی کیفیات سے ہٹ کر تھا۔ ممکن ہے یہ نادر کشف کی کوئی ایسی صورت ہو جس میں جسم کی مکمل شرکت کا احساس حاوی ہو۔ یہ کشف تھا تو تب بھی میں نے اپنے پورے جسم کو اس تجربے میں پوری طرح شریک پایا تھا۔

یہ تجربہ جو کچھ بھی تھا اس کا روحانی کنکشن میرے دادا جی اور ابا جی کے تجربوں سے تھا۔ اور اب مجھے یہ تینوں تجربے ایک ہی تجربے کا تسلسل لگنے لگے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے
نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے
اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم
اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے

روحانی تجربے کے بعد تک اس کے اثرات

جو تجربہ ہونا تھا ہو چکا تھا لیکن اس کے اثرات ابھی تک موجود تھے۔ یہ اثرات میرے اندر بھی موجود تھے اور باہر بھی موجود تھے۔ بچوں کے سوالات کے جواب دینے کے ساتھ بھائی بہنوں سے اور بعض خاص احباب سے بھی گفتگو ہونے لگی۔

30 جولائی کو امریکہ سے میری بہن زبیدہ نے میری خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا۔ چھوٹا بھائی نوید عید منانے کے لئے اپنے بچوں کے ساتھ زبیدہ کے ہاں پہنچا ہوا تھا۔ زبیدہ سے اور راحت بھابی سے تو ہلکی پھلکی سی گفتگو ہوئی لیکن نوید کے ساتھ سلسلۂ کلام طویل ہو گیا۔ میں نے اپنے روحانی تجربے کی روداد اسے سنائی تو اسے مزید سننے کا اشتیاق ہوا۔ پھر ہماری گفتگو خاندان کی بعض پرانی مگر اہم باتوں کی طرف چلی گئی۔ نوید نے کرید کرید کر سوال پوچھے۔ بعض بے حد پرانی باتوں کو چھیڑا۔ میری طرف سے کسی توقف کے بغیر اسی وقت وضاحت کر دی جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ نوید کو دنیاداری کے باوجود روحانی معاملات سے گہرا شغف تھا۔ نوید نے جو سوالات کئے۔ میرے جوابوں سے کچھ مطمئن بھی ہوا۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی شیئر کیں جو اس کے پاس امانت ہیں۔

میرے تجربے سے جڑی گفتگو کا سلسلہ تین گھنٹے اور چند منٹ تک جاری رہا۔ پھر امریکہ والے فون کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی۔ نوید نے یہ اطلاع دی تو میں نے ہنس کر کہا آپ کے فون کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی لیکن میری بیٹری ابھی تک فل چارج ہے۔

کچھ دیر کے بعد نوید نے دوبارہ رابطہ کرنا چاہا تو رابطہ نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے اپنی بھتیجی رضوانہ کو فون کیا۔ اس سے میرے بارے میں استفسار کیا۔ رضوانہ نے کچھ آنکھوں دیکھا بتاتے ہوئے کہا ایسا لگتا تھا ابو کی ساتویں حس بیدار ہوگئی ہے۔ اس پر نوید نے ہنستے ہوئے کہا

ساتویں حس؟۔۔۔۔۔ مجھے تو ان کی دسویں حس تک بیدار اور روشن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فون پر یہاں تک کی سرگوشیاں بھی سن رہے تھے اور پرانی باتیں جیسے انہیں ازبر تھیں۔

ہمبرگ کے کنارے Norderstadt میں ایک دوست ہیں کولمبس خان صاحب۔ 31 جولائی کو ان کی طرف سے صحت یابی کی دعا کا میسیج ملا۔ آخر میں انھوں نے میرا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

سب گزرے ہوئے پیارے مجھے دِکھنے لگے ہیں
یا سامنے آئینے کی دیوار کھڑی ہے

یہ شعر پڑھتے ہی یاد آیا کہ میری یہ تئیس چوبیس سال پرانی غزل پوری کی پوری اسی موڈ کی تھی اور کمال یہ ہے کہ گزشتہ چار دنوں میں جو تجربہ ہوا تھا، بالکل اسی تجربے کے بیان پر مشتمل تھی۔ 1997 میں چھپنے والے میرے چوتھے شعری مجموعہ ''دعائے دل'' میں شامل وہ غزل یہاں درج کر دیتا ہوں۔ ان اشعار کو میرے حالیہ تجربے کے واقعات کے ساتھ خود ہی ملا کر دیکھئے۔

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے
قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے
ہم نے ترے غم میں کوئی مالا نہیں پہنی
سینہ ہی دَمکتے ہوئے زخموں کی لڑی ہے
خاطر میں مگر پھر بھی کہاں لائے کبھی ہم
کب اہلِ ملامت پہ نہ اُفتاد پڑی ہے
موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لئے اور
یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اَڑی ہے
ہے زندگی و موت میں اک معرکہ برپا
جیتے کوئی، ہم پر یہی اک رات کڑی ہے
سب گزرے ہوئے پیارے مجھے دِکھنے لگے ہیں
یا سامنے آئینے کی دیوار کھڑی ہے

دیکھو ہمیں، ہم ہنستے ہوئے جانے لگے ہیں
کچھ جان پہ گزری ہے نہ نزع کی تڑی ہے
کیا اور محبت کا یقیں اُن کو دِلائیں
دَم آنکھوں میں اٹکا ہے نظر اُن پہ گڑی ہے
تشریف تو لے آئے وہ حیدؔر دمِ رخصت
سو اپنے لئے اتنی عنایت ہی بڑی ہے

☆☆☆

31 جولائی کو پہلے کراچی میں آپی کے ساتھ بات ہوئی۔ میرے سارے حال کو آپی نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ ہماری گفتگو ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ آپی خود کراچی میں شدید بیمار رہی تھیں اور ابھی ابھی ہسپتال سے چھٹی ملنے کے بعد گھر پہنچی تھیں۔ اسی دن جرمنی میں موجود آپی کے بیٹے اور اپنے بھانجے کامران کے ساتھ بھی بات ہوئی۔ کچھ ان کا حال سنا اور کچھ اپنا حال سنایا۔

یکم اگست سے پانچ اگست تک پھر طبیعت بگڑنے لگی۔ چونکہ جون سے اب تک میں گھر پر ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ چلنا پھرنا گھر کے اندر تک ہی تھا، اس لئے قبض کی شکایت تو قابلِ فہم تھی لیکن ساتھ ہی یورین انفیکشن ۔۔۔ یہ بہت تکلیف دہ صورت تھی۔ 5 اگست کو شام کے وقت ایک بار پھر ایمبولینس بلانا پڑی۔ اس کا میں ''بیماریوں کا حال'' میں ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے ابھی آگاہ نہیں کیا گیا تھا لیکن سٹیشن B-25 کے کمرہ نمبر 58 میں یہ میری آخری رات تھی۔ مجھے چھت پر ڈراؤنی فلموں، ڈراموں کے مختلف کرداروں جیسی شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے چہرے اور ہاتھ دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ساری شکلیں اوٹ پٹانگ سے ایکشن کر رہی تھیں۔ مجھے ان کی حرکتیں مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد کمرے کے دائیں جانب بالکونی میں چار پانچ ڈراؤنے کردار پورے قد وقامت کے ساتھ آ گئے۔ اب وہ وہاں سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے تھے۔ مقصد مجھے ڈرانا تھا لیکن میں نے ان کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا تو ان میں سے ایک نے جمپ لگائی اور میرے سرہانے تک پہنچ گیا۔ تب میں نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ اگر تم

جان لینے آئے ہو تو لے جاؤ، میں تیار ہوں۔لیکن اگر صرف اچھل کود کر کے مجھے ڈرانے آئے ہو تو
اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو۔اس حالت میں مضحکہ خیز لگ رہے ہو۔

اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بالکنی والے بھی اور چھت والے بھی سارے کردار غائب ہو گئے۔

صبح ڈاکٹر اپنے وزٹ پر آئی تو بیماری اور علاج کے حوالے سے بات کرنے کے بعد اس
نے عجیب سا سوال پوچھ لیا۔کیا آج کل آپ کو خواب میں اپنے پرانے رشتہ دار دکھائی دیتے ہیں؟
میں نے کہا اپنے رشتہ دار تو دکھائی نہیں دیئے لیکن آج رات اس طرح ڈراؤنے کردار دکھائی دیئے
ہیں۔ڈاکٹر مسکرائی اور ساتھ ہی اس نے بتایا کہ آج ہی مجھے اسی سٹیشن کے ایک اور کمرے میں
شفٹ کیا جائے گا۔دوپہر کے بعد میں کمرہ نمبر 58 سے کمرہ نمبر 52 میں بھیج دیا گیا۔دن ہسپتال
کے معمولات کے مطابق گزر گیا۔رات کو اطمینان کے ساتھ نیند آ گئی۔

مزے کی نیند سویا ہوا تھا کہ اچانک لاؤڈ اسپیکر سے کوئی آواز سنائی دی۔میرا نام لے کر
مجھے کہا گیا کہ اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو اور اپنی دائیں جانب دیکھو۔

میں نے دائیں جانب دیکھا تو وہاں پرائمری کلاسز کے بہت سارے بچے رنگ برنگے ملبوسات
میں دکھائی دیئے۔ان کے ساتھ بچوں کے پسندیدہ مختلف اور مقبول کارٹونز کے کردار زور زور سے
ڈرم بجا رہے تھے، گیت گا رہے تھے۔نئی موسیقی کے باوجود وہ بچوں کے گیت تھے، اس لئے سمجھ
میں بھی آ رہے تھے اور اچھے بھی لگ رہے تھے۔اس منظر کا سب سے خوبصورت حصہ یہ تھا کہ بچے
گیت گاتے ہوئے جھوم رہے تھے، لہرا رہے تھے اور یہ سب کچھ بڑے والہانہ انداز میں ہو رہا تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی مجھے فوراً صبح ڈاکٹر کا پوچھا ہوا سوال یاد آیا اور ساتھ ہی ذہن اس طرف گیا کہ
میرے داماد عادل نے گوگل سے کچھ تلاش کیا ہے اور مجھے ایسے خواب دکھانے والی کوئی دوا اسی
ڈاکٹر کے ساتھ ڈسکس کی ہے اور اسی کے نتیجہ میں مجھے کوئی دوا دے کر ایسا خواب دکھایا گیا
ہے۔میں اسی حالت میں عادل کی ذہانت اور جدید میڈیکل سائنس کی پیش قدمی پر خوش ہو رہا
ہوں اور اپنی بیٹی درِثمین سے کہتا ہوں کہ یہ عادل تو بڑا کام کا بندہ نکلا۔اسے سنبھال کر رکھنا اور
ضائع مت ہونے دینا۔اس کے ساتھ ہی پھر وہی آواز آئی۔اب اپنی بائیں جانب دیکھو۔

میں نے بائیں جانب دیکھا تو وہاں بھی ویسا ہی منظر تھا۔سامنے بھی ویسا منظر تھا۔پھر میرے
سامنے نیم دائرے کی صورت میں ایک وسیع میدان تھا اور سارا ایریا جھومتے، لہراتے اور گاتے
ہوئے بچوں سے بھرا ہوا تھا۔میں زندگی سے بھرپور یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ یک دم منظر بدل گیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک خوفناک صورتِ حال سامنے تھی۔میں نے پہچانا کہ یہ
No Mans Land ہے۔یہاں میرے سارے بچے اور ان کے سارے بچے میرے سامنے پڑے
ہوئے تھے، وہ درد سے کراہ رہے تھے اور ان میں سے بعض کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔
لاؤڈ اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز پھر سنائی دی۔تمہاری مرنے کی خواہش نے تمہاری محبت میں
ان سب کو بھی اس حال میں پہنچا دیا ہے۔یہ ابھی بھی دنیا میں واپس بھیجے جا سکتے ہیں۔اب
تمہارے پاس آخری موقعہ ہے، ابھی اور اسی وقت کھڑے ہو جاؤ اور سب دنیا میں واپس چلے جاؤ
ورنہ اب تم سب کو آگے بھیج دیا جائے گا۔میں حیران تھا کہ میری تو اُس دنیا سے واپسی ہو چکی ہے
پھر یہ کیا ماجرا ہے؟ لیکن کچھ کہے بغیر میں فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔پھر ایسے لگا جیسے ہم سب اِسی دنیا
میں ہیں اور سارے بچے اپنی اپنی زندگی کے معمولات میں مصروف ہیں۔

بعد میں جب عادل اور درِثمین کو یہ حال سنایا تو عادل نے بتایا کہ میں نے ایسا تو کچھ
نہیں کیا، نہ ہی ڈاکٹر سے کوئی بات ہوئی ہے لیکن چند روز پہلے میں نے درِثمین سے کہا تھا کہ انکل
سے اب کہنا چاہئے کہ بے شک اپنے لئے نہ سہی لیکن انہیں اب ہمت کر کے بیماریوں سے چھٹکارا
پا کر اپنے بچوں کے لئے اُٹھ کھڑے ہونا چاہئے۔عادل کا درِثمین سے ایسا کہنا اور بعد میں اس سے
ملتا جلتا منظر خواب میں آنا میرے لئے دلچسپی کا موجب ہوا۔

تب سے اب تک تھراپیاں بھی ہو رہی ہیں، بہت ساری دوائیں بھی باقاعدگی سے لے رہا ہوں
لیکن پھر نہ وہ چار دنوں والے تجربے جیسا کچھ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اور طرح کا کوئی تجربہ ہوا ہے۔
سب کچھ نارمل اور معمول کے مطابق چل رہا ہے۔**الحمدلله**۔

شکرگزاری

لگا تار بیماریوں سے گزرتے ہوئے، روحانی تجربے سے بھی گزرتے ہوئے ہر گام اور ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل وکرم اور عنایات شاملِ حال رہیں، زندگی بھر کی دوسری عنایات کے ساتھ ان عنایاتِ خاص پر اپنے پیارے خدا کا شکرگزار ہوں۔

بیماریوں کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں جرمنی کے نظامِ صحت کو ملکی قوانین کا حصہ جانتے ہوئے بھی جرمن حکومت اور نظامِ صحت کے اقدامات کو خود پر احسان سمجھتا ہوں اور جرمن حکومت اوران کے نظامِ صحت کا شکرگزار ہوں۔

باڈزودن اور ہوئیسٹ کے ہسپتالوں میں جن ڈاکٹرز، نرسز اور دیگر عملہ نے میرے علاج معالجہ سے لے کر دیکھ بھال تک سارے امور ہمدردی اور خصوصی توجہ کے ساتھ سرانجام دیئے، ان سب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سب کے لیے دعا گو ہوں۔ اپنے Dr. med.Gerd Ehrhardt اور ڈاکٹر ابرار احمد کا بھی شکرگزار ہوں کہ ان کے ساتھ تو بظاہر زندگی بھر کا واسطہ ہے۔ ان کی خصوصی توجہ ہمیشہ میری صحت میں بہتری لائی ہے۔

ان بیماریوں کے دوران میرے سارے بچوں نے جس طرح بے چین ہو کر بھاگ دوڑ کی اور مضطرب ہو کر میرے لئے دعائیں کیں، ان پر بھی اپنے سارے بچوں کا شکرگزار ہوں۔
پھر میرے روحانی تجربے کے دوران ان بچوں نے جس طرح جمع ہو کر ساتھ نبھایا اس پر بھی ان سب کا شکریہ۔ بیٹے، بیٹیاں، بہو، داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسی سب کا شکرگزار ہوں۔
نام بنام ـــ: رضوانہ کوثر، شعیب حیدر، عثمان حیدر، طارق محمود حیدر، درثمین، تسنیم حیدر، حفیظ کوثر

، عادل انور، شہریار حیدر، شایان حیدر، شیراز حیدر، جہاں زیب حیدر، ماہ نور حیدر، ثانیہ حیدر، علیشا حیدر، مشہود کوثر، مسرور کوثر، احتشام کوثر، ساحل انور، ساحر انور اور عنایہ کوثر ان سب کا شکریہ اور سب کے لئے دنیا وآخرت کی بھلائیوں کی بے شمار دعائیں!۔۔۔۔۔۔

چھوٹے بیٹے طارق محمود حیدر (ٹیپو) کا بہت زیادہ شکریہ کہ ہر طرح کی بھاگ دوڑ سے لے کر مجھ سے متعلق بیشتر ذمہ داریوں کو اٹھانے اور نبھانے تک اس نے بہت خدمت کی ہے اور ابھی تک میری بہت ساری ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہے۔ ٹیپو کے لئے مزید بہت ساری دعائیں اور **جزاک اللہ۔**

جن عزیزوں اور احباب نے نجی طور پر بھی اور سوشل میڈیا کے ذریعے بھی بیماری کے اول روز سے اب تک میری صحت یابی کے لیے خلوصِ دل سے دعائیں کیں، مسلسل میری خیریت پوچھتے رہے، ان سب کا بھی بہت بہت شکریہ۔
سارے عزیز واقارب اور دوست احباب اب بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

حیدر قریشی

ایک بار پھر

مجھے جو کچھ پیش آیا، میں نے جو روحانی تجربہ کیا، اسے جہاں تک بیان کرنا ممکن تھا، میں نے بیان کر دیا ہے۔ میں اسے ایسا نادر کشف سمجھتا ہوں جو عام کشوف سے مختلف ہے اور جس میں مجھے میرا پورا جسم بھی شریک محسوس ہوتا رہا۔ میرے دادا جی اور ابا جی کے تجربات سے جڑا ہوا میرا تجربہ میرے لئے ایک روحانی تجربہ تھا۔ میں نے اپنے تجربے میں خود آپ کو شریک کیا ہے۔

آپ اسے ایسا ہی سمجھیں، یا اسے میری بیماریوں کا اثر سمجھیں،

دواؤں کا ری ایکشن سمجھیں، یا کچھ اور سمجھیں،

آپ کو اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

میرا لکھا ہوا اپنی جگہ موجود ہے۔ اور موجود رہے گا۔ دماغ کی بیداری کے ساتھ میں نے اسے سچے دل سے لکھا ہے، سو اسے کتابِ دل سمجھیں۔

کہیں کہیں میں نے اپنی بعض باتوں کو ایک سے زیادہ مرتبہ بیان کیا ہے۔ یہ ان باتوں کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ضروری تھا۔ جب آپ ان باتوں پر غور کریں گے تو آپ کو ان کے دہرائے جانے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اپنی اڑانیں، ساری شانیں، تیرے دَم سے یار

تیرے ہاتھ ہوائیں ساری تیرے ہاتھ میں ڈور

حیدر قریشی

حیدر قریشی

بوند بھر روشنی

بوند بھر روشنی تھی مگر یوں لگا

جیسے اک بوند میں ہی سمندر بھرا ہو

میں اُس بوند میں تھا یا وہ بوند مجھ میں

ابھی تک یہ عقدہ نہیں کھل سکا ہے

مگر ایک منظر سا کچھ یاد ہے کہ

سمندر کے اندر سمندر گرا تھا

انوکھی سی اک روشنی کا عجب موج در موج سا

جگمگاتا ہوا سلسلہ تھا

جسم اور روح جیسے مقابل بھی تھے، باہم آمیز بھی

شاید ایسا ہی کچھ تھا یا کچھ اور تھا۔۔۔۔

ایسے لگتا ہے اب بوند بھر روشنی میں

فقط اک سمندر نہیں، جانے کتنے سمندر، رواں تھے

اس میں کتنے ہی سورج ستارے چمکتے تھے

اور کہکشائیں خلا در خلا رقص کے حال میں تھیں

جہاں ساری سمتیں ہی بے معنی سی ہو گئیں

سارے بُعد اور سارے زمانے

کسی ایک نقطے میں جیسے سمٹ آئے تھے

وہ نقطہ وہی بوند تھا

بوند بھر روشنی!

بیماری یا روحانی تجربہ

(17 ستمبر 2020 کے بعد سے جنوری 2022 تک کی مختصر روداد)

17 ستمبر 2020ء کو کینسر کی تھراپی کے بعد میں نے تب تک کی اپنی بیماریوں کا حال لکھ لیا تھا اور اسے ''بیماری یا روحانی تجربہ'' کے نام سے ای بک کی صورت میں آن لائن کر دیا تھا۔ اکتوبر 2020ء سے یہ کتاب ان لنکس پر موجود ہے۔

پی ڈی ایف فائل میں

https://drive.google.com/file/d/1gkRE8ht3JiyI5ca3ep22phaVrr1ffNIH/view

http://my27books.blogspot.com/2014/04/blog-post_880.html

یونی کوڈ میں

https://punjnud.azurewebsites.net/PageList.asp
x?BookID=17743&BookTitle=Beemari%20Ya%20Roohani%20Tajraba

تب سے جنوری 2022ء تک کا مختصر حال اب بیان کرتا ہوں۔ اس سے میری بیماری یا روحانی واردات یا روحانی تجربے کو مزید سمجھنے کا موقعہ ملے گا۔

ستمبر 2020ء کے بعد دسمبر 2020ء تک کیموتھراپی اور امیون تھراپی دونوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دسمبر میں امیون تھراپی کے لئے وقفہ تجویز کیا گیا تاہم کیموتھراپی بدستور جاری رکھی گئی۔ 2021ء کے شروع سے بھی میرے لئے ایمبولینس بلانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ مختلف دیگر امراض کی وجہ سے بار بار ایمرجنسی میں جانا پڑ رہا تھا۔ ایک بار شوگر ڈاؤن ہونے کے باعث کیموتھراپی بھی روک دی گئی۔ اس سے میں کچھ فکر مند ہوا کہ امیون تھراپی میں وقفہ دینے کے بعد دوبارہ شروع نہیں ہوئی اور اب کیموتھراپی بھی بند کی جا رہی

ہے۔ کہیں جگر میں کینسر بڑھ نہ جائے۔

رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ بچے میرے ہاں آئے ہوئے تھے۔ 8 مئی 2021ء کو میں بیدار ہوا تو بچے سحری کر چکے تھے۔ بیداری کے باوجود میں گھر کے کسی فرد کو پہچان نہیں رہا تھا۔ منجھلا بیٹا عثمان گھر میں آیا تو میں نے بچوں میں صرف اس سے کچھ گفتگو کی۔ میری حالت دیکھتے ہوئے ایمبولینس بلا لی گئی۔ جرمن ڈاکٹر کے ساتھ میں نے بڑے مزے سے جرمن میں بات کی۔ حالانکہ عام طور پر جرمن بولتے ہوئے دو چار جملوں کے بعد ہی میرا سانس پھول جاتا ہے۔ ایمبولینس والے مجھے نارڈ ویسٹ ہسپتال لے گئے۔ یہ ہسپتال دماغی امراض کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لگ بھگ چار گھنٹوں کے بعد میں اپنے ہوش وحواس میں آیا تو بچوں سے رابطہ کیا۔ تب مجھے اپنی اصل داستان معلوم ہوئی کہ کن مراحل سے ہوتا ہوا ہسپتال پہنچا ہوں۔

8 مئی سے 19 مئی تک میں ہسپتال میں داخل رہا۔ اس دوران 12 مئی کو میرا ایم آر ٹی ٹیسٹ ہوا۔ تشخیص ہوا کہ مجھے برین ٹیومر ہے اور یہ ایسا ٹیومر ہے جو بڑی تیزی سے سارے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ میں گردے میں ٹیومر کی خبر سے بھی گھبرایا نہیں تھا۔ پھر جگر میں کینسر کی خبر نے بھی گھبراہٹ پیدا نہیں کی تھی۔ ہاں تھراپیوں کا سلسلہ رک جانے کے باعث تھوڑا سا متفکر ضرور ہوا تھا۔ تب میں نے متبادل کے طور پر ایک دیسی دوا لینا شروع کر دی۔ سُچی بُوٹی کی گولیاں میری بیٹی رضوانہ نے اپنی سہیلی کرن کے ذریعے منگا دی تھیں۔ دو ہفتے میں نے یہ گولیاں استعمال کیں۔ اسی دوران کرن کے مشورے سے دودھ میں ہلدی ملا کر پینے کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے شروع کر دیا۔
اللہ کے فضل وکرم سے یہ دونوں ٹوٹکے مفید ثابت ہوئے۔ اللہ کرن بی بی کو جزائے خیر دے۔ آمین

ان دو ٹوٹکوں کے علاوہ میں نے اول روز سے سورہ رحمٰن کی تلاوت سننا شروع کر دی۔ یہ قاری عبدالباسط کی قرات میں یوٹیوب پر دستیاب ہے۔ بہت سارے احباب نے اس کا مشورہ دیا تھا اور یہ تلاوت سننے کی تھراپی میرے لئے بے حد مفید اور بابرکت ثابت ہوئی۔ میں نے یہ تلاوت سننے کا سلسلہ ابھی بھی جاری رکھا ہوا ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی میرے برین ٹیومر کی۔۔۔ اب برین ٹیومر کی خبر نے مجھے سچ مچ پریشان کر

دیا تھا۔ چنانچہ اللہ میاں سے کچھ باتیں کیں۔ پھر وہ باتیں الفاظ کے تھوڑے سے ادل بدل کے ساتھ اللہ میاں سے بار بار کیں۔ اب ہسپتال والوں نے طے کیا کہ 9 جون 2021ء کو دوبارہ ہسپتال میں جاؤں گا۔ وہاں ایک بار پھر ایم آر ٹی ہوگا اور 10 جون کو میرا برین ٹیومر کا علاج شعاعوں کے ذریعے شروع کیا جائے گا۔ مجھے جتنی برین ٹیومر کی خبر نے پریشان کیا تھا اتنی ہی پریشانی اور گھبراہٹ شعاعوں والے علاج کا سوچ سوچ کر ہو رہی تھی۔ میں تو ایم آر ٹی بھی ہمیشہ بے ہوشی کے ساتھ کراتا ہوں۔ اب یہ شعاعوں والا علاج (بِش ٹرالنگ) باہوش وحواس کرانا ہوگا۔ 9 جون سے دو تین دن پہلے اپنی بڑی بیٹی رضوانہ سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ یہ برین ٹیومر بالکل اچانک ہی آیا ہے۔ جیسے اللہ نے اچانک یہ بیماری بھیجی ہے ویسے ہی یہ اچانک جا بھی تو سکتی ہے۔ رضوانہ نے کہا ہاں اللہ چاہے تو یہ بیماری بالکل جا سکتی ہے۔ تب میں نے رضوانہ سے کہا کہ آپ بھی دعا کریں اور میں بھی دعا کرتا ہوں کہ جیسے یہ بیماری اچانک آئی ہے ویسے ہی اچانک واپس چلی جائے۔ چنانچہ ہم دونوں باپ بیٹی نے اس حوالے سے دعا کی۔ باقی بچے ویسے عمومی طور پر صحت یابی کی دعا کر رہے تھے۔

۹ جون کو پروگرام کے مطابق ایم آر ٹی چیک اپ ہوا۔ 10 جون کو بش ٹرالنگ سے پہلے اسٹیشن کے ڈاکٹر کے ساتھ بڑا ڈاکٹر بھی آیا اور مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ ایم آر ٹی میں برین ٹیومر نہیں مل رہا۔ اس لئے اب شعاعوں والا علاج نہیں ہوگا۔ تاہم ستمبر میں دوبارہ ایم آر ٹی کریں گے تاکہ صورتِ حال مزید واضح ہو جائے۔ میں نے تب یہ میسیج اپنے سارے عزیز واقارب اور دوست احباب اور ادبی گروپ کو بھیج دیا۔

'' اللہ پاک کا بہت ہی خاص کرم ہو گیا ہے۔

رمضان شریف کے مہینے میں برین ٹیومر تشخیص ہوا تھا شعاعوں کے ذریعے علاج طے ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں کل ہسپتال گیا تھا۔ وہاں MRT میں ظاہر ہوا کہ کوئی ٹیومر شیومر نہیں ہے جبکہ اسی ہسپتال اور اسی MRT سنٹر نے ہی پہلے بیماری کی تشخیص کی تھی اور اسی نے "بِش ٹرالنگ" (شعاعوں والا طریق علاج) طے کیا تھا۔ اللہ کا بہت ہی خاص کرم ہو گیا ہے جیسے بیماری اچانک آئی تھی ویسے ہی

اچانک غائب بھی ہو گئی۔ الحمدللہ۔۔۔سبحان اللہ۔۔۔۔

یہ کوئی سنی سنائی نہیں خود پر بیتی اور مغربی جدید تر ہسپتال کے ریکارڈ میں موجود بات ہے۔ (حیدر قریشی۔**10.6.2021**)''

پروگرام کے مطابق ستمبر میں پھر ہسپتال گیا، ایم آر ٹی ہوا، اور ایک بار پھر برین ٹیومر نہ ہونے کی خوش خبری ملی۔ تب میں نے حسبِ معمول اپنے سارے عزیز واقارب، دوست احباب اور ادبی گروپ کو یہ میسیج بھیجا۔

'' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اس کے فضل وکرم سے لگ بھگ تین ماہ کے بعد ہونے والے MRT سے پھر تصدیق ہو گئی کہ برین ٹیومر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے الحمدلِلہِ ثم الحمدللہ۔ دعا میں یاد رکھنے والے سارے بچوں، عزیز واقارب اور احباب کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔ ابھی ہسپتال میں ہوں۔ کل تک چھٹی مل جانے کی امید ہے۔ ان شاءاللہ۔

اب جگر کے کینسر کا چیک اپ ہونا باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ اس سے بھی نجات مل گئی ہو گی اور مکمل طور پر کینسر فری ہو جاؤں گا۔ ان شاءاللہ۔ سارے بچوں، عزیز و اقارب اور دوست احباب سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں بھی دعا میں یاد رکھیں۔ آمین ثم آمین۔ (حیدر قریشی**7.9.2021**..)''

سات ستمبر 2021ء کو میں اس امید کا اظہار کر رہا تھا کہ میں جگر کے کینسر سے بھی نجات پا چکا ہوں۔ بعد میں یہ درست ثابت ہوا۔ نومبر، دسمبر 2021ء تک میں نے سارے عزیز واقارب اور قریبی دوستوں کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھ پر اللہ کا فضل وکرم ہو چکا ہے، میں کینسر سے نجات پا چکا ہوں بس میڈیکل رزلٹ کا انتظار ہے۔ مجھے واقعی یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں کینسر سے نجات پا چکا ہوں۔ بعد میں 10 جنوری 2022ء کے سی ٹی سکین سے واضح ہو گیا کہ میں واقعی جگر کے کینسر سے بھی نجات پا چکا ہوں۔ الحمدللہ۔۔۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔ اور جرمنی کے میڈیکل سسٹم کا بھی شکریہ کہ مجھے اتنی اچھی میڈیکل سہولتیں میسر رہیں۔

فروری 2020ء سے جنوری 2022ء تک میں نے کینسر کے تین زوردار حملوں کا سامنا کیا۔ پہلے

فروری 2020 میں بائیں گردے میں ٹیومر ملا اور وہ گردہ ہی نکال دیا گیا۔ پھر 26 جون 2020 کو جگر میں کینسر دریافت ہوا اور اس کا علاج مکمل ہونے سے پہلے 12 مئی 2021 کو برین ٹیومر بھی ظاہر ہو گیا۔۔۔۔کینسر کے ان سارے حملوں کے باوجود اللہ نے اپنے بہت ہی خاص فضل و کرم سے مجھے کینسر سے مکمل نجات عطا کر دی ہے۔

یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ 6 اور 7 جولائی 2020ء کی درمیانی شب کو فرحت نواز نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب اس کتاب کے صفحہ نمبر **16-17** پر درج ہے۔ تاہم اس کی آخری سطروں کے الفاظ یہاں درج کر دیتا ہوں۔

''میں اسی جگہ کھڑی خواب میں ہی سوچ رہی ہوں کہ اب آپ نے ٹھیک ہو جانا ہے۔ان شاءاللہ۔ میری آنکھ کھلی تو سامنے کلاک پہ پورے تین بج رہے تھے۔''

تب بعض دوستوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس خواب کی بابت باتیں کی تھیں۔ ہر انسان کے سوچنے کی اپنی اپنی سطح ہوتی ہے۔ وہ دوست بھی اپنی جگہ ٹھیک ہوں گے لیکن فرحت نواز کے خواب کی سچائی آج روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ اللہ فرحت بی بی کو خوش رکھے۔ آمین۔

اسی رات میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ خواب بھی اسی کتاب کے صفحہ **17** پر پہلے سے درج ہے۔

''میں نے خواب دیکھا کہ پرانی اور بوسیدہ سی کسی عمارت میں ایک تنگ سے کوریڈور سے میں آگے جانا چاہتا ہوں لیکن ایک بدمعاش جو نہایت تگڑا اور لمبے قد کا ہے میرا رستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ مجھے مارنا چاہتا ہے یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور میں اس سے دل ہی دل میں ڈر بھی رہا ہوں۔ پھر یکا یک نہ صرف وہ بدمعاش غائب ہو گیا بلکہ دیکھا کہ میں تنگ کوریڈور کی بجائے کسی عمارت کی کھلی چھت پر کھڑا ہوں۔ وہیں سے ٹہلتے ہوئے میں ایک دوکان پر جاتا ہوں۔ وہاں سے دولڈو لیتا ہوں اور انہیں کھانے لگتا ہوں۔''

کینسر وہ بدمعاش تھا جس سے بچنے کی مجھے کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔ پھر اس کا غائب ہو جانا اور میرا کھلی چھت پر موجود ہونا کینسر سے نجات کی خوش خبری تھی۔ اور دولڈو لے کر کھانے کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ میرے دونواسوں مشہود اور مسرور کی شادیوں کا ولیمہ 27 دسمبر 2021ء کو ہوا اور مجھے

اس خوشی میں شرکت کا موقعہ ملا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

مشہود کی شادی چند ماہ پہلے ہو چکی تھی۔ مسرور کی اب ہو رہی تھی۔ 20 دسمبر 2021ء کو مہندی کی رسم تھی۔ میں اس تقریب میں شریک ہوا لیکن اگلے دو دن طبیعت خراب رہی تو چیک کیا۔ کورونا ٹیسٹ مثبت آرہا تھا۔ 23 سے 26 دسمبر تک کورونا رہا۔ میں مسرور کی شادی کی تقریب میں شریک نہ ہو سکا۔ تاہم 27 دسمبر کو قریبی ٹیسٹ سنٹر میں چیک کرایا تو ٹیسٹ کا رزلٹ نیگیٹو آ گیا۔ خوشی ہوئی کہ آج شام کو دونوں بچوں کے ولیمہ میں شامل ہو سکوں گا۔ سوایسا ہی ہوا اور یوں ایک ساتھ دولڈو کھانے کی تعبیر دونوں نواسوں کے ولیمہ میں شرکت کی خوشی سے ظاہر ہو گئی۔ الحمدللہ۔

فرحت کا خواب اور اپنا خواب بیان کرنے کے بعد تب ہی صفحہ نمبر **18** پر میں نے یہ الفاظ لکھے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ دونوں خوابوں کی تعبیریں از خود ظاہر ہیں اور کینسر سے میری نجات اور شفایابی کی تسلی دیتی ہیں۔ ہاں فرحت کے خواب میں میرے شیونگ کٹ اٹھانے سے میں نے یہ مراد لیا کہ زندگی معمول پر آ جائے گی۔ باقی واللہ اعلم۔ (ویسے زندگی معمول پر آ تو چکی ہے)۔

بے شک اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنے گنہگار اور کمزور بندوں کو ہر طرح سے تسلی دے دیتا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔''

میری ہولناک بیماریاں، میرا روحانی تجربہ، میرے خواب اور ان کی تعبیریں اور تب ہی میرے تاثرات اور اب وہ سب کچھ کسی تاویل کے بغیر سچ ثابت ہونا خدا پر میرے کامل یقین کا ثمر ہے اور خدا کی میرے ساتھ شفقت اور محبت کا واضح نشان ہے۔ اس کے لئے اُس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

یہاں اس بات کو واضح کر دوں کہ میرے نزدیک کسی انسان کا خدا سے معاملہ براہِ راست خدا اور انسان کا آپس کا معاملہ ہے۔ اگر اس کی اپنے لئے کی گئی دعائیں پوری ہو جاتی ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسے دوسروں کے لئے دعائیں کر کے انہیں قبول کرانے کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ جو اس قسم کے دعا گو پائے جاتے ہیں اور جو اپنی ایسی تشہیر کے لئے خاص اہتمام کرتے ہیں وہ عمومی طور پر دعا کے نام پر دھندہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر خلقِ خدا کو بے وقوف بنا کر ان سے نذریں

اورنذرانے وصول کرتے ہیں۔ ہاں کوئی بندہ دعا گوئی کو دھندہ بنائے بغیر کسی کی ہمدردی میں دعا کرتا ہے تو ایسے بندے کی دعا قبول ہوسکتی ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے مسائل کے حل کے لئے خود اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے۔ اپنے مسائل، اپنے دکھوں کو کوئی انسان جتنا خود سمجھتا ہے ویسا انہیں کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا اور جس اضطراب کے ساتھ کوئی انسان اپنے لئے خود دعا مانگ سکتا ہے ویسا کوئی بھی نہیں مانگ سکتا۔

یہ سب اس لئے بیان کرنے کی نوبت آئی کہ حالیہ دنوں میں ایک ڈیسنٹ سی لیڈی فوزیہ محمود کے ساتھ رابطہ ہوا۔ انہوں نے میری بعض تحریروں کو پڑھ رکھا تھا۔ انہوں نے ان کا ذکر کیا اور کہنے لگیں کہ آپ نے جس انداز میں اپنے بعض روحانی تجربوں کو بیان کیا ہے، انہیں پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ پھر وہ اپنے بعض مسائل کا عمومی ذکر کر کے مجھے خصوصی طور پر دعا کے لئے کہنے لگیں۔ ان کی ''دعا کی درخواست'' سن کر میں گھبرا گیا۔

ایک تو اس لئے کہ اپنی باتوں سے وہ مجھے اپنے آپ سے کہیں زیادہ اور بہتر اللہ سے لو لگانے والی خاتون محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کے اثرات بڑے واضح طور سے اپنے آپ پر محسوس ہو رہے تھے۔ دوسرا یہ کہ ''دعا کی درخواست'' کے الفاظ سے مجھے گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے انہیں واضح طور پر کہا کہ ایسا کبھی نہیں کہیں۔ کسی سے بھی کہنا ہو تو اتنا کہہ دیں کہ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ عاجزانہ طور پر کسی انسان سے دعا کی درخواست کی جائے تو اس کے دماغ میں تو خناس سما جائے گا۔ کچھ نہ ہو کر بھی وہ خود کو پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنے لگ جائے گا۔

پھر میں نے انہیں میرزا ادیب کا ایک قصہ سنایا۔۔۔وہ کرشن نگر سے اردو بازار تک پیدل جایا کرتے تھے۔ رستے میں لاہور میوزیم آتا تھا۔ میرزا ادیب کچھ دیر کے لئے اس میوزیم میں چلے جاتے۔ وہاں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ ہوتا تھا۔ میرزا ادیب اس مجسمے کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے اور کچھ دیر کے لئے آنکھیں موند کر عالمِ استغراق میں چلے جاتے۔ کئی دن ایسے گزرتے گئے۔ ایک دن میوزیم کے عملے کے کسی فرد نے ان سے پوچھ لیا کہ یہ آپ روزانہ آ کر کیا کرتے ہیں؟

میرزا ادیب نے جواب دیا کہ مجھے ایسے بیٹھنے سے سکون ملتا ہے۔

مزید چند دن گزرے۔۔۔ایک دن مہاتما بدھ کا مجسمہ بول اٹھا کہ ہو سکے تو مجھے یہاں سے نکال کر کہیں باہر لے چلو کیونکہ میں یہاں بہت بے سکون ہوں۔

یہ قصہ سنا کر میں نے فوزیہ محمود صاحبہ سے کہا کہ میری تو اپنی بہت ساری دعائیں اٹکی ہوئی ہیں۔ وہ ہی ابھی تک پوری نہیں ہو رہیں، کسی اور کے لئے کیا دعا کروں۔

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک، نہ مستجاب ہوئے

نجی طور پر دوسرے احباب کے حوالے سے اور بہت ساری باتیں ہیں جو اس دوران ذاتی رابطے میں پیش آتی رہیں لیکن ان سب کا بیان کرنا مناسب نہیں لگ رہا۔ ہاں اس عرصہ میں یہ دیکھنے میں آیا کہ میرے بعض مخالفین، جنہوں نے اپنی چالاکی سے عناد کی ساری حدیں پار کر لی تھیں اور میں دو سال کا عرصہ کسی بھی جوابی کارروائی سے گریز کر کے اپنی بیماریوں کے علاج پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ ان میں سے بعض بہت زیادہ چالاک اور اپنے اپنے دائرہ کار میں طاقت ور لوگوں کو شدید خدائی پکڑ میں آتے دیکھا۔ ان میں ادبی دنیا سے متعلق لوگ بھی ہیں، مذہبی دنیا کے لوگ بھی ہیں اور سماجی سطح پر بلا وجہ تکلیف دینے والے بھی شامل ہیں۔ ان کی جو پکڑ ہوئی اس پر اپنی سال 2000ء کی ایک تحریر یاد آ گئی۔

''میں جب بھی مظلومیت کی حالت میں ہوا' میرے ساتھ ظلم کرنے والا کوئی عام انسان تھا تو وہ بھی خدا کی گرفت سے نہیں بچا اور اگر کسی کو خدا سے تعلق کا کوئی زعم تھا اور اس نے میرے خلاف کوئی ظالمانہ کارروائی کی تو جس نوعیت کی کارروائی کی گئی' زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے اندر ویسی ہی کارروائی خود اس کے خلاف ہو گئی یا اس سے بھی زیادہ رُسوائی اسے بڑے پیمانے پر مل گئی۔ میں نے ایک چیز اور بھی نوٹ کی ہے۔ اگر میں کسی کی زیادتی کا بدلہ خود لے لوں تو میرا بدلہ ہی اس کی سزا ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں کسی سے بدلہ نہ لے سکوں۔۔۔خواہ مجبوری کے باعث' خواہ صبر کر کے۔۔۔ میری خاموشی کے نتیجہ میں ظالم کو قدرت کی طرف سے ایسی سزا ملی کہ میں خود بھی بعض اوقات دُکھی

ہو گیا کہ مولا! اتنی کڑی سزا تو انہیں نہ دینا تھی۔"

("کھٹی میٹھی یادیں" کے باب "دعائیں اور قسمت" ص 62-61۔ "گلبن" مئی، جون 2000ء)

میں نے تین دنیاؤں کے تین لوگوں کا تو حال ہی میں ایسا انجام دیکھا کہ واقعتاً میں خود دکھی ہو گیا کہ مولا! یہ سزا تو کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ یہاں ایک ضروری وضاحت کر دوں کہ میں نے سال 2000ء میں "تین ماہ کے اندر زیادتی کرنے والوں کو سزا" ملنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہلکی پھلکی سزا ہوتی تھی۔۔۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ سفاک لوگ زیادہ شدید گرفت میں بھی آئے۔ ایک صاحب تو موت کے بعد بھی دنیا میں ابھی تک رسوا ہو رہے ہیں اور بڑے پیمانے پر رسوا ہو رہے ہیں۔ لیکن میں کسی بھی نام کی نشان دہی کیے بغیر اس ذکر کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ یہ سب صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذکر کے طور پر بیان کیا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تحدیثِ نعمت کے الفاظ کہیں میرے اندر تکبر نہ پیدا کر دیں۔ سو یہیں محتاط ہوتا ہوں۔

میں نے بہت پہلے سے ایک دعا مانگ رکھی تھی کہ میری عمر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 63 سال سے آگے نہ جائے۔ یہ دعا پوری نہیں ہوئی تو میں اپنی 63 سال کے بعد کی ساری عمر کو اللہ تعالیٰ کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض سمجھتا ہوں۔

اپنی اہلیہ مبارکہ کی وفات کے بعد میں نے مبارکہ کی قبر کے ساتھ والی قبر کا پلاٹ اپنے لئے بک کرا لیا تھا۔ وہاں اپنا اور مبارکہ کا مشترکہ کتبہ لگا دیا ہوا ہے۔ اس کتبہ پر قرآنی آیات کے ساتھ سب سے نیچے میں نے یہ شعر بھی درج کرا رکھا ہے۔

اور تھے حیدر جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

جب بھی دعا کے لئے قبرستان جاتا ہوں وہاں اپنی ہی قبر کی جگہ پر کھڑے ہو کر مبارکہ کی مغفرت کے لیے دعا مانگتا ہوں۔

مذکورہ دونوں باتیں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی تمام تر بشری کمزوریوں کے باوجود موت میرے لئے خوف کا باعث نہیں بلکہ وصل کا پیغام ہے۔ فروری 2020 سے لے کر جنوری 2022ء

تک میں نے سنگین بیماریوں سے لے کر ہولناک بیماریوں تک کا سامنا کیا لیکن انہیں بیماریوں کے دوران مجھے چار روز پر محیط وہ روحانی تجربہ بھی نصیب ہوا جس نے مجھے اپنے ابا جی اور دادا جی کے روحانی تجربوں کے ساتھ پوری طرح جوڑ دیا۔ ہماری تین نسلوں کا ملتے جلتے روحانی تجربوں سے گزرنا اور ان میں ایک ارتقائی تسلسل کا پایا جانا میرے لئے سراسر سعادت اور نیک بختی ہے۔

تمام بیماریوں اور ان بیماریوں کے سارے دُکھوں کو سہنے کے بعد اب میں صحت و سلامتی کے ساتھ 70 برس کا ہو چکا ہوں. اور اب بھی اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔ وہ اب مجھے صحت تندرستی کے ساتھ جب بھی اپنی بارگاہ میں بلانا چاہے میں صدقِ دل کے ساتھ بخوشی حاضر ہوں۔ اور وہ جتنی زندگی دینا چاہتا ہے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

راضی ہوں تیری مرضی پر، لیکن بھید کھلے بھی
تیری مرضی کیا ہے یارا، کچھ تو کھل کر بول

حیدر قریشی۔۔۔جرمنی سے

19 جنوری 2022

ڈر ہے رازوں کے افشا کا موجب نہ بن جائے
حیدر بھید بھرے دل کا اب چھید بھرا دل ہونا

"کھٹی میٹھی یادیں" کا ایک باب

لبّیک الّھمّ لبّیک

قل ان کانت لکم الدّار الآخرة عنداللہ خالصة من دون الناس فتمنو الموت ان کنتم صادقینo و لن یتمنوہ ابداً بما قدمت ایدیھم ط واللہ علیم بالظّلمینo

(سورۃ **البقرۃ** ۔آیت ۹۴۔۹۵)

(**ترجمہ:** تو ان سے کہہ اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر (باقی) لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے، تو اگر تم [اس دعویٰ میں] سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔(یاد رکھو کہ) جو کچھ ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، اس کے سبب سے وہ کبھی بھی (موت کی) تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے)

مجھے جنوری ۲۰۰۹ء میں ایک خواب کے ذریعے واضح طور پر بتایا گیا کہ ۳؍دسمبر کو میری وفات ہو گی۔ میں یہ تحریر نومبر کے آخری عشرہ میں لکھ رہا ہوں اور قارئین تک تب پہنچے گی جب ۳؍دسمبر ۲۰۰۹ء کا دن گزر چکا ہوگا۔

زندگی کے معاملہ میں دو جمع دو چار کی طرح کوئی دوٹوک اور حتمی بات کہہ کر گزر جانا ممکن نہیں۔ ہر انسان کی زندگی اس کے اپنے ڈھب سے ہوتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ کیا کیا اور اس نے زندگی کے ساتھ کیا کیا؟ دونوں معاملات ہی ہر انسان کی ذات اور اس کی اپنی کائنات کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ میری چھوٹی سی کائنات خاندانی سطح پر میرے والدین، بہن بھائیوں، بیوی، بچوں اور ان سب سے منسلک رشتہ در رشتہ کہکشاں پر مشتمل ہے۔ ان سارے رشتوں کا ذکر اذکار میرے، خاکوں اور یادوں میں نمایاں طور پر اور دوسری اصناف میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب کہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب بندہ اِس دنیا سے آگے کی دنیا میں جانے کے لیے بوریا بستر باندھنے میں لگا ہوتا ہے، میں نے بھی کچھ عرصہ سے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر رکھا ہے۔ اگلی دنیا میں جانے کی تیاری کے ساتھ اِس دنیا سے لذت کشید کرنے کا عمل بھی میں نے کم نہیں ہونے دیا۔ میری اہلیہ

مبارکہ ان معاملات میں ایک حد تک میرے ساتھ ہے اور ایک حد تک مزاحمت کر رہی ہے۔ اس دنیا کے معاملات میں تو نہ صرف اس نے مزاحمت نہیں کی بلکہ بڑی حد تک پردہ پوشی بھی کی ہے۔ البتہ اگلی دنیا کے معاملہ میں اس نے شدید مزاحمت کر رکھی ہے۔ اس حوالے سے جو تازہ ترین صورتحال ہے اسے بعد میں بیان کروں گا پہلے گزرے دنوں کا کچھ ذکر ضروری ہے۔

۱۹۹۶ء میں مبارکہ کو Rheumatism کی بیماری کی ابتدا ہوئی تھی۔ پہلے تو بیماری کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی۔ پتہ نہیں یہ "روئے ماٹ ازم" کونسی اللہ ماری ولایتی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ ہم نے تو سوشلزم، کمیونزم، کیپٹل ازم کے نام ہی سن رکھے تھے اور مبارکہ کو ان میں سے کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ بہرحال بیماری کی نوعیت کا جب کچھ کچھ اندازہ ہوا تو اس کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے ۱۹۹۶ء ہی میں ایک غزل میں کہا تھا:

دیکھو مجھے اس حال میں مت چھوڑ کے جانا
دل پر ابھی میں نے کوئی پتھر نہیں رکھا

پھر مبارکہ نہ صرف اس بیماری کی عادی ہو گئی بلکہ Rheuma نے بھی اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ بارہ تیرہ برس علاج معالجہ کے ساتھ آرام سے گزر گئے۔ مبارکہ کی علالت اور اپنے شروع میں بیان کردہ خواب کا مزید ذکر ذرا آگے چل کر۔۔۔۔۔ یہاں یادوں کے اس نئے باب کے تناظر میں اپنی پرانی تحریروں کا تھوڑا سا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کے آخری سرے پر لکھی گئی میری یادوں کے باب "دعائیں اور قسمت" کا اختتام ان دعائیہ الفاظ پر ہوتا ہے۔

"اب یہی دعا ہے کہ ایسی ہی دافع البلیّات دعاؤں کے سائے میں زندگی کا یہ سفر آسانی کے ساتھ، حفاظت کے ساتھ، اور بے حد آرام و سکون اور اطمینان کے ساتھ مجھے اگلی دنیا میں لے جائے۔ موت میرے لئے دُکھ کا مُوجب نہیں راحت کا مُوجب بنے۔ ہجر کا احساس نہیں بلکہ وصل کا پیغام ہو اور وصل کا راحت بھرا پیغام تو جب بھی آئے عشّاق کی خوش نصیبی ہوتا ہے۔"

یہ کوئی دنیا کو جتانے یا بتانے کا رویہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے مقابلہ میں موت کے تئیں میرا یہ رویہ میری ابتدائی شاعری سے اب تک کسی نہ کسی رنگ میں آتا چلا گیا ہے۔ زندگی اور موت کے معاملہ میں میرا رویہ میرے مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً میرے شعری مجموعوں کی بالکل ابتدائی غزلوں سے لے کر

اب تک کی شاعری کے یہ اشعار دیکھیں۔

موت سے پہلے جہاں میں چند سانسوں کا عذاب
زندگی! جو قرض تیرا تھا ادا کر آئے ہیں

دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا
کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے

چلو پھر آنکھیں کرو چار موت سے حیدرؔ
پھر آج موت کی آنکھوں میں زندگی بھر دو

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہو گا ادا میرے بعد

موت کی بھی حقیقت انہیں سے کھلی
زندگی کے جو دل میں دھڑکتے رہے

موت کو چھو کے دیکھنا ہے ذرا
زندگی، اپنی دیکھی بھالی ہے

گزشتہ برس میری دو غزلوں میں اس حوالے سے زیادہ کھلا اظہار سامنے آیا:

کفن مرے لیے دامانِ یار ٹھہرے گا
چلوں گا کوچۂ دلدار میں لحد کے لیے

تمام خواہشیں حیدرؔ کبھی کی چھوڑ چکے
کہو تو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

ایسے اشعار کے زمانی تسلسل کے درمیان میں کہیں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب موت مجھے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، زندگی کے ساتھ کچھ دیر کے لیے الجھی، مگر پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اُس وقت کی کیفیات میری تب کی ایک غزل میں موجود ہیں۔

موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لیے اور
یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اڑی ہے
ہے زندگی و موت میں اک معرکہ برپا
جیتے کوئی، ہم پر یہی اک رات کڑی ہے
دیکھو ہمیں ہم ہنستے ہوئے جانے لگے ہیں
کچھ جان پہ گزری ہے نہ نزع کی تڑی ہے

ہمبرگ کے خالد ملک ساحل صاحب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھے اپنی بالکل ابتدائی شاعری کے دو شعر یاد آ گئے۔ یہ غزل ہفت روزہ مدینہ بھاولپور میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں کہیں چھپی تھی، میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اس کے ان دو اشعار سے موت کے تئیں میرے رویہ اور بالخصوص ابتدائی رویہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

کوئی آوارہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی
موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی
شور سنتے تھے بہت لیکن حقیقت اور ہے
ایک ہی تو سانس پر اٹکی ہوئی ہے زندگی

۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء کو میں نے صبح چار بجے کے لگ بھگ ایک خواب دیکھا۔ اس میں مجھے تاریخِ وفات ۳؍دسمبر بتائی گئی۔ خواب میں سَن نہیں بتایا گیا لیکن بیداری پر مجھے اس کی جو تفہیم ہوئی اس کے مطابق سال ۲۰۰۹ء ہی میں وفات ہوگی۔ اس تفہیم کے ساتھ ایک بار پھر غنودگی کی کیفیت ہوئی اور اس میں یہ قرآنی الفاظ میرے ہونٹوں پر جاری ہوئے: **انی متوفیک**۔ یعنی بے شک میں تجھے وفات دوں گا۔

میں نے اسی روز صبح پانچ بجے سبز رنگ کی جلد والی اپنی نوٹ بک کے بائیں جانب اندر کے پہلے صفحہ پر وہ خواب، اور اس کی تعبیر و تفہیم درج کر دی، اپنے دستخط بھی کر دیئے۔ اسی روز اپنے چھوٹے بیٹے طارق کو وہ نوٹ بک دکھا کر بتا دیا کہ دسمبر ۲۰۰۹ء میں اگر کچھ رونما ہو جائے تو اس تحریر کو خود بھی پڑھ لینا اور بہن بھائیوں کو بھی پڑھا دینا۔ ساتھ ہی اسے کچھ اور ہدایات بھی دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ طارق نے دو چار دن تک تو صبر سے کام لیا لیکن پھر گھبرا کر اپنی ماں کو اس بارے میں بتا دیا۔ مبارکہ کو خواب کی کچھ حقیقت کا اندازہ ہوا تو وہ خود بیمار پڑ گئی۔ یہاں تک کہ ۶ فروری کو ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ ہفتہ بھر صورتحال اتنی زیادہ نازک رہی کہ ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی طرف سے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بچ جانے کے چانسز ہیں تو سہی لیکن بہت کم۔ کیونکہ قوتِ مدافعت کمزور ہوتے ہی Rheuma نے تقریباً تمام مرکزی اعضا پر حملہ کر دیا ہے۔ ان آرگنز کو بچانے کے لیے جن دواؤں کو دیا جا سکتا ہے وہ موجودہ صورت میں جتنی مفید رہیں گی، سائڈ ایفیکٹ میں اس سے زیادہ نقصان دہ ہوں گی۔ عجیب مشکل اور پیچیدہ صورتحال تھی۔ بہر حال دعا اور دوا دونوں کے نتیجہ میں مبارکہ نے ایک مہینہ کے لگ بھگ عرصہ میں بیماری کو کچھ کور کر لیا۔ شیمو تھراپی جو کینسر کے مریضوں کے لیے ہوتی ہے، اس کا پانچ فیصد چھ مہینوں میں آزمانے کا طے ہو گیا۔ پانچ مہینوں میں مبارکہ اس حد تک صحت یاب ہو گئی کہ مجھے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔ کامیاب شوہر بخوبی جانتے ہیں کہ بیوی جب شوہر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پوری طرح سے صحت یاب ہو چکی ہے۔ وگرنہ ناکام و نامراد شوہر تو بیوی سے سرِ عام جوتے یا دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سمجھ اور سیکھ پاتا، البتہ اس کے انجام سے لوگ سبق ضرور سیکھ لیتے ہیں۔

مبارکہ کی حالت سنبھلنے تک ۲۰۰۸ء کے آخر میں دی گئی، میری بائیں آنکھ کے موتیا کے آپریشن کی تاریخ آ گئی۔ اطہر خان جیدی جو پاکستانی مزاحیہ ڈرامہ کا ایک معروف نام ہیں، ان کا ایک شعر حسبِ حال ہو گیا۔

ہم نے پھولوں کی آرزو کی تھی
آنکھ میں موتیا اتر آیا

۲؍مارچ کو آپریشن ہوا اور اسی دن مجھے چھٹی بھی مل گئی۔ دو تین دن احتیاط سے کام لیا اور پھر اپنی معمول کی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کی تجویز دی گئی تھی۔ چند مہینوں کے بعد جب اس کی نوبت آئی، دائیں آنکھ کے کنارے پر نیچے کی جانب ایک چھوٹا

سا دانہ نکل آیا۔ بس اس دانے کے ختم ہونے تک آپریشن موخر کر دیا گیا۔ جو تا حال موخر چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہ تاخیر تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال بات ہو رہی تھی مبارکہ کی اپنی سنگین بیماری کے وار سے بچ کر گھر واپس آ جانے کی۔

مبارکہ کا بہتر حالت میں گھر واپس آنا خدا کا بہت ہی خاص فضل تھا۔ گردوں کی کارکردگی متاثر ہونے کے باعث اس کے پورے جسم سے پانی رِستا تھا۔ خوشی سے بھیگنا اور غم میں آنسوؤں سے بھیگ جانا تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے لیکن بیماری سے اس طرح بھیگنا ہمارے ہاں پہلا تجربہ تھا۔ جسم بھی کسی حد تک پھول گیا تھا، تاہم تھراپی کرانے کے نتیجہ میں حالت تدریجاً بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران مبارکہ کو نہانے کے لیے تو مدد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن نہانے کے بعد کھڑا کرنے اور ٹب میں سے باہر نکالنے میں مجھے بہت زیادہ ہیلپ کرنا پڑتی۔

اپنے افسانہ ''گھٹن کا احساس'' میں ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ ہوئی بات کو میں نے یوں لکھا ہوا ہے۔

''نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔ اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی:

''مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے''

وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔ یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔''

اور اب صورت حال یہاں تک آ پہنچی تھی کہ ہم انڈین فلموں کے باتھ روم سے بڑھ کر انگریزی فلموں کے باتھ روم والے سین جیسی صورتحال سے گزر رہے تھے۔ مبارکہ کا وزن بہت بڑھ گیا تھا اس لیے اس سین کا مزہ تو کیا لیا جاتا، میرا سانس ہی پھولنے لگتا۔ یہ سانس پھولنے کا سلسلہ بڑھا تو ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر نے ای سی جی تک کے اپنے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد مجھے ہسپتال ریفر کر دیا۔ ہسپتال والوں نے ٹیسٹ کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد بتایا کہ دل کا کوئی وال (شریان) بند ہے۔ انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی دونوں کام ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے۔ اس کے لیے یکم اکتوبر کی تاریخ

دے دی گئی۔

انہیں دنوں میں ایک نئی غزل ہوئی، جس کے یہ اشعار جیسے ۳ر دسمبر کے لیے ذہنی تیاری کی غمازی کر رہے تھے۔

درد دِل کی ہمیں اب کے وہ دوائی دی ہے
اپنے دربار تلک سیدھی رسائی دی ہے
اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے
نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے
کیسے زنجیر کا دل ٹوٹا یہ اُس نے نہ سُنا
وقت نے قیدی کو بس فوری رہائی دی ہے
اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم
اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے
جب بھی جانا ہے پلٹ کر نہیں دیکھیں گے کہیں
اپنے اندر سے یہ آواز سنائی دی ہے

اکیس ستمبر کو عید الفطر تھی، عید بہت اچھی گزری۔ سارے بچے گھر پر جمع ہوئے۔ پانچ بیٹے بیٹیاں، پانچ بہوئیں اور داماد، دس پوتے، پوتیاں اور نواسے۔۔ گھر پر اتنی رونق تھی کہ ہم دونوں تھک گئے۔ بائیس ستمبر کو میں ڈٹسن باخ میں خانپور کے زمانے کے ایک دوست وزیر احمد صاحب کو ملنے چلا گیا۔ شام کو گھر آیا تو مبارکہ کی طبیعت خراب تھی، بخار ہو گیا تھا۔ رات گئے تک بخار میں شدت آ گئی اور صبح تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اس کی لیڈی ڈاکٹر فراؤ ہے نگ (Frau Hennig) کو گھر پر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے مبارکہ کی حالت دیکھتے ہی ایمبولینس منگا لی۔ جاتے وقت مبارکہ پر غشی سی طاری تھی۔ اسے قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ ۲۴ تاریخ تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے صوبائی صدر مقام ویزبادن کے اس ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں پہلے سے اس کا ''روئے ما'' کا علاج چل رہا تھا۔ انتہائی نگہداشت والے کمرہ میں جب ہم دیکھنے کے لیے پہنچے تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں کے ڈاکٹرز نے کہا کہ ہم بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے کیسز میں بچنے کا صرف ایک فی صد چانس ہوتا ہے۔ جو بچہ اندر آتا اور رونے لگتا میں اسے باہر بھیج دیتا۔ رفتہ رفتہ بچوں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا شروع کیا۔

میں تو مستقل طور پر مبارکہ کے سرہانے کھڑا ہوا تھا، بچوں کو دو سے زیادہ تعداد میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ جب بھی کوئی بچہ آتا۔ میں پوچھتا یہ کون ہے؟ آواز نہیں آتی تھی لیکن مبارکہ کے ہونٹ اس طرح ہلتے جس سے بچے کا نام ادا ہوتا ہوا پورا سمجھ میں آتا۔ حالت تو غیر ہی تھی لیکن تیسرے دن دو دلچسپ باتیں ہوئیں جس سے مجھے کچھ تسلی ہونے لگی۔ میں نئے کپڑے پہن کر ہسپتال پہنچا۔ مبارکہ نے آنکھ کھولی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''کتھے چلے او'' (آپ کہاں جا رہے ہیں؟)۔ جب بیوی بے ہوشی اور بے خبری کی حالت میں بھی نگرانی کی اس حد تک آ جائے تو اسے کون بے ہوش یا بے خبر کہے گا۔

جب سارے بچے باری باری آ کر ماں سے مل چکے تو مبارکہ نے دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے کہا آپ اب وہاں بیٹھ جائیں۔ مجھے ان دونوں باتوں سے کافی تسلی ہو گئی۔ لیکن کمال یہ ہے کہ جب مبارکہ بالکل صحت یاب ہو گئی تو اسے ان باتوں میں سے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ صرف اتنا یاد تھا کہ بچوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیتی تھیں اور بس۔

مجھے اندازہ ہے کہ اصلاً مبارکہ کو اندر سے یہ خوف ہے کہ میں دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں۔ فروری والی بیماری کے دوران میں نے اسے بڑے رسان سے کہا تھا کہ مبارکہ بیگم! آپ زیادہ فکر مت کریں، میں پہلے چلا گیا تو جاتے ہی آپ کو بلوا لوں گا۔ آپ پہلے چلی گئیں تو میں بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہوں گا، آپ کے پیچھے پیچھے ہی چلا آؤں گا۔ لیکن شاید ہم دونوں کے درمیان اہلِ لکھنو کے ''پہلے آپ۔۔۔ پہلے آپ'' کے برعکس ''پہلے میں۔۔۔ پہلے میں'' کا مقابلہ چلا ہوا ہے۔ اس چکر میں شاید موت کا فرشتہ بھی کنفیوز ہو رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ پہلے کسے لے جاؤں؟

۲۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو مبارکہ ابھی انتہائی نگہداشت والے روم میں تھی، گردن میں، ہاتھ پر، سینے پر، بازو پر مختلف کنکشنز لگے ہوئے تھے۔ ایک بازو اور ہاتھ کے الٹی طرف ڈرپیں لگانے کے لیے، ایک بازو پر بوقتِ ضرورت ٹیسٹ کرنے کی غرض سے خون لینے کے لیے، گردن اور سینے پر کہیں ڈائلسز کے لیے، کہیں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے لیے اور کہیں پتہ نہیں مزید کن کن مقاصد کے لیے کنکشن کی تاریں ہی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ مبارکہ کیا تھی، اچھی بھلی روبوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے روبوٹ کو بالکل انسان جیسا دکھائی دینے کا تجربہ کر لیا گیا ہو۔ ہم سارے گھر والے اسے دیکھ کر واپس گھر پہنچے۔ چائے بنانے کے لیے کہا، چائے بن کر ٹرے میں ہی چائے کے کپ رکھ کر لائی جا رہی تھی کہ اچانک میری چھ سالہ پوتی ماہ نور

کمرے سے باہر کی طرف دوڑ کر گئی اور اپنی چچی کی اٹھائی ہوئی چائے کی ٹرے سے ٹکرا گئی۔ یہ حادثہ ایسے ہوا کہ ساری چائے ماہ نور پر آن گری۔ فوراً ایمبولینس کو بلایا۔ ایمبولینس پہنچی تو انہوں نے حادثہ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ایک اور ایمبولینس بلالی۔ ہم سمجھے ابھی فرسٹ ایڈ دے رہے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ گھر پر ہی اصل علاج شروع کر دیا گیا تھا۔ معاملہ کی سنگینی کا تب احساس ہوا جب انہوں نے ہیلی کاپٹر بھی منگالیا۔ ماہ نور اور اس کی امی تسنیم دونوں ہیلی کاپٹر سے من ہائم کے یونیورسٹی کلینک روانہ ہوئے۔ یہ شہر ہمارے شہر سے ایک گھنٹہ کی ڈرائیو پر ہے۔ بچوں کے اس طرح کے جلنے کے علاج کے سلسلہ میں اسے خصوصیت حاصل ہے۔ شعیب اور میں، ہم دونوں کار کے ذریعے من ہائم روانہ ہو گئے۔ من ہائم اور ویزبادن کے دونوں ہسپتال بالکل مختلف سمتوں میں واقع ہیں۔ بہر حال ابھی پہلے بحران سے نکلے نہ تھے کہ دوسرا بحران آ گیا۔ اور تیسرا بحران یکم اکتوبر کو میرے دل کا وال (شریان) کھولنے کی صورت میں پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ان سارے بحرانوں میں گھرا ہوا تھا اور تب ہی میری گیارہ کتابوں کی کتاب ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کا لائبریری ایڈیشن اور جدید ادب کا جنوری ۲۰۰۹ء کا شمارہ ریلیز ہو چکا تھا۔ اسی دورانیہ کے اندر میں نے ارشد خالد کے عکاس انٹرنیشنل کے نارنگ نمبر کے لیے بنیادی نوعیت کا کام بھی نمٹایا۔ اسی دوران ہی میں نے نہ صرف اپنی کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کی بیک وقت ہندوستان اور پاکستان سے اشاعت کو ممکن بنایا بلکہ جنوری ۲۰۱۰ء کا جدید ادب کا شمارہ بھی انہیں ایام میں مکمل کر کے اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ اور اب جبکہ نومبر کے آخری عشرہ کے شروع میں یادوں کا یہ باب لکھ رہا ہوں تو جدید ادب کا اگلے سال جنوری ۲۰۱۰ء کا شمارہ جدید ادب کی ویب سائٹ پر ریلیز کیا جا چکا ہے اور کتابی صورت میں چھپ جانے کی اطلاع بھی آ گئی ہے۔ اور انشاءاللہ نومبر کے مہینے کے اندر ہی کتابی صورت میں ریلیز بھی کیا جا رہا ہے۔ اسی اثناء میں غزلیں، نظمیں بھی تخلیق ہوئیں، ایک نیا افسانہ بھی لکھا گیا، اور اب یادوں کا یہ نیا باب بھی مکمل کر رہا ہوں۔ انہیں ایام کے دوران ہی خدا نے مجھے چوتھا پوتا شیراز حیدر بھی عطا کر دیا۔ یہ شعیب کا دوسرا بیٹا ہے۔

فالحمدللہ علی ذالک!

جب شیراز کی پیدائش ہوئی مبارکہ ہسپتال میں تھی۔ ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی سب سے پہلے اس ہسپتال میں گئی جہاں شیراز کی پیدائش ہوئی تھی، وہاں پوتے کو دیکھا، چوما، دعا کی اور پھر گھر واپس آئی۔ اپنے دو نواسوں اور ایک پوتے کے ختم قرآن کا ذکر یادوں کے ایک باب میں کر چکا ہوں۔ اس عرصہ میں مزید

پیش رفت یہ ہوئی کہ گزشتہ برس عثمان کے بیٹے اور میرے دوسرے پوتے جہاں زیب نے فروری میں ساڑھے پانچ برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا۔ اس برس جولائی میں جہانزیب کی بہن علیشا نے پونے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا۔ ماہ نور بھی بیس پارے پڑھ چکی ہے اور اگلے دو تین ماہ تک اس کے ختم شریف کی بھی امید ہے۔ سو اپنی ذاتی زندگی کی اس سال کی اچھی خبروں میں ان خبروں کو بھی شمار کرتا ہوں۔ ایک بار پھر **شکر الحمدللہ**!

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ویسے تو سارے بچے بہت فرمانبردار اور خیال رکھنے والے ہیں۔ ہمارے عمرہ اور حج کی توفیق میں ان کا بھرپور ساتھ شامل رہا ہے۔ جب مجھے کسی ذاتی کام کے لیے رقم کی ضرورت پیش آئی اور میں نے تینوں بیٹوں کے ذمہ کچھ رقم لگائی، سب نے وہ رقم فراہم کر دی۔ عام حالات کے مطابق میرے کہے بغیر بھی طارق نے دو تین اہم مواقع پر از خود میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خاصی معقول رقم فراہم کی ہے۔ تاہم مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ بڑا بیٹا شعیب ایک عرصہ سے ہر سال ایک معقول رقم خاموشی کے ساتھ ماں کو دے رہا ہے۔ مجھے کئی برس کے بعد اب علم ہوا تو میں نے دونوں ماں بیٹے کو نصیحت کی کہ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا تاکہ میں تحدیث نعمت کے طور کہیں اس کا ذکر کر دیتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے اس کا ذکر کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

یکم اکتوبر کو میری انجیوگرافی اور انجیو پلاسٹی ہوئی۔ ایک سائڈ پر سکرین پر سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سمندروں ڈوہنگے دل دریا کی گہرائیوں میں تو کئی بار غوطہ زن ہوا ہوں، لیکن اس کی مواجی کا منظر ایک اور طرح سے دیکھ رہا تھا۔ دائیں ران سے سوراخ کر کے تار وہاں سے گزارا گیا جو بائیں جانب مقیم دل تک پہنچنا تھی۔ تو جناب یہ دل بائیں جانب ہی کیوں ہوتا ہے اور دائیں جانب سے چل کر ہی بائیں جانب والے دل کا علاج کیوں کیا جاتا ہے۔ ادب میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے مکاتب فکر کی کہانی بھی شاید ران اور دل کے رشتے کی کہانی ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ۔

میں ادب میں دائیں بازو، بائیں بازو والوں کی کارگزاری کے ساتھ مشینوں کی انسان دوستی کا منظر بھی دیکھ رہا ہوں۔ علامہ اقبال نے اپنے حساب سے کہہ دیا تھا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ مشینیں دل کے لیے موت کا نہیں بلکہ حیات کا پیغام

بن رہی ہیں۔پیس میکر کی صورت میں دل کا محافظ تو متعارف ہو چکا ہے، حال ہی میں جاپان کے سائنس دانوں نے پلاسٹک کا ایسا دل تیار کیا ہے جو کارکردگی کے لحاظ سے اب تک کے سارے متبادل ذرائع سے زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوگا۔

علامہ اقبال کی بعض باتیں آج بھی درست ثابت ہو رہی ہیں، لیکن مشینوں کو دل کے لیے موت قرار دینے کی طرح ان کی بعض باتیں درست ثابت نہیں ہوئیں۔انہوں نے مغربی تہذیب کو للکارتے ہوئے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب نے تب سے اب تک خودکشی نہیں کی، البتہ عالمِ اسلام کے کئی خطوں سے چلتی ہوئی خود کش حملوں کی وبا اب پاکستان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔میں یہاں کسی موازنۂ مشرق و مغرب میں نہیں پڑ رہا۔بس اتنا سا اشارہ ہی کافی ہے۔بات ہو رہی تھی، جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان کو ملنے والی سہولتوں کی۔میرے لیے آپریشن کا سارا مرحلہ خیروخوبی کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔لیکن چند گھنٹوں کے بعد شدید تکلیف اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔دائیں ٹانگ کو پٹیوں سے جکڑ دیا گیا تھا اور اگلے چھ گھنٹے تک اس ٹانگ کو ہلانا سختی کے ساتھ منع تھا۔چھ گھنٹے تک ٹانگ کو نہ ہلانے کا احساس اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ میں اس کرب کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔رات مجھے ہسپتال ہی میں گزارنا تھی۔رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب دائیں ٹانگ کو جکڑ بندی سے نجات ملی تو میں نے فوراً ہسپتال کی جانب سے پہنایا گیا ملنگوں جیسا چولا اتارا، اپنا لباس پہنا اور چہل قدمی کرتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔سردی کے باوجود کھلی فضا میں بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔باری باری سارے بچوں کو فون کیا۔سب کو اپنی خیریت سے آگاہ کیا، ان سب کی خیریت دریافت کی۔مبارکہ اور ماہ نور کا حال پوچھا۔گھنٹہ بھر باہر گھومنے کے بعد ہسپتال میں واپس آ گیا۔اگلے دن دوپہر کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔اسی دن شام کو مبارکہ سے ملنے گیا۔وہ انتہائی نگہداشت والے روم سے اب درمیانی نگہداشت والے روم میں منتقل ہو گئی تھی۔ہوش میں آ گئی تھی لیکن کوئی جنبش از خود نہیں کر سکتی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں خود اپنے دل کے معاملے سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔ابھی اسے اپنے بارے میں یا ماہ نور کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔جیسے جیسے مبارکہ روبصحت ہو رہی تھی ویسے ویسے ماہ نور کی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔اس کا چہرہ تو خدا نے اپنے فضل سے محفوظ کر دیا تھا۔سینے کے بیشتر داغ بھی کم ہو رہے

تھے اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ بچی بہت چھوٹی ہے اس لیے ایک سے دو سال تک یہ داغ بھی دور ہو جائیں گے۔

مبارکہ کو جب مختلف کنکشنز سے آزاد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں جہاں سے سوئی وغیرہ کو ہٹاتے، وہاں گہرے سرخ داغ نمایاں ہو جاتے۔تن ہمہ داغ داغ شد والا منظر تھا۔پنبہ کجا کجا نہم کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ایک دن کے بعد یہ گہرے سرخ داغ جیسے نیلے سے رنگ میں ڈھلنے لگے اور مجھے پنجابی کا ''تن من نیل و نیل'' یاد دلانے لگے۔(ویسے کمال ہے کہ ایک مہینہ کے اندر ہی وہ گہرے داغ ایسے ختم ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں)۔

۲۳ راکتوبر کو مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی لیکن اس خبر کے ساتھ کہ ہفتہ میں تین بار ڈائلسز ہوا کرے گا۔سرکاری طور پر ہی سارا انتظام کیا گیا ہے۔مقررہ وقت پر ٹیکسی آتی ہے اور گھر سے ہسپتال لے جاتی ہے، چار سے پانچ گھنٹے کے درمیان ڈائلسز کا عمل مکمل ہوتا ہے تو ٹیکسی گھر چھوڑ جاتی ہے۔مبارکہ کی بیماری، اپنی پوتی ماہ نور کے حادثہ اور اپنے دل کے علاج تک تین چار ہسپتالوں سے واسطہ رہا۔کہیں بھی امیر یا غریب، جرمن یا غیر جرمن کا فرق دکھائی نہیں دیا، کہیں بھی ہسپتال کے عملہ میں دیکھ بھال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔وہ جو مسیحا نہ مقام تھا ہر جگہ دکھائی دیا۔انسانی خدمت کا ایسا اعلیٰ معیار کہ سوچنے بیٹھیں تو آنکھیں شکر گزاری سے بھیگ جائیں۔ہمارے معاشرے کے لوگ اپنی ذہنیت کے مطابق اان کے بارے کیا کچھ باور کرتے ہیں لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اپنی خدمتِ انسانی کے اعلیٰ ترین معیار کے باعث ان لوگوں نے سچ مچ اپنی جنت کما لی ہے۔

اپنی اس علالت کے نتیجہ میں مبارکہ کا وزن پچاس کلو کے لگ بھگ رہ گیا۔بیشتر کپڑوں کی نئی فٹنگ کرانی پڑی، چھوٹی بیٹی کا شادی سے پہلے کا ایک کوٹ پورا آ گیا۔اب بہو بیٹیوں میں حسرت کے ساتھ مبارکہ کو دیکھا جاتا ہے کہ ہائے امی! آپ اتنی سمارٹ ہو گئی ہیں۔

میرے دل کا وال (شریان) ٹھیک کر دیا گیا تھا لیکن سانس پھولنے کی کیفیت نہیں جا رہی تھی۔ڈاکٹر اور ہسپتال کے دو معائنوں کے بعد فرینکفرٹ کے یونیورسٹی کلینک کے ریڈیالوجی نیوکلیر میڈیسن کے شعبہ میں چیک اپ کے لیے بھیج دیا گیا۔یہ چار گھنٹے طویل دورانیے کا چیک اپ تھا۔پہلے مرحلہ میں جب مجھے انجکشن لگا کر سائیکلنگ کرائی جا رہی تھی تو ڈاکٹر بار بار پوچھتی تھی کہ دل میں کوئی گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟ میں مزے سے سائیکل چلائے جا رہا تھا اور ہر بار بتا رہا تھا کہ دل کو کوئی

گھبراہٹ نہیں ہو رہی، البتہ سائیکل چلاتے ہوئے ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں جب مجھے لٹا کر اوپر ایک مشین لائی جانے لگی تو شدید گھبراہٹ ہونے لگی۔ میرے دونوں ہاتھ اس طرح سے میرے سر کے نیچے تہہ کر دیئے گئے تھے کہ میں اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے کہا میں اپنے جوتے اتارنا چاہتا ہوں، جواب ملا آپ اسی طرح پڑے رہو، ہم خود جوتے اتار دیتے ہیں۔ پندرہ منٹ تک کسی جنبش کے بغیر پڑے رہنا تھا، یہ بھی ٹانگ سیدھی رکھنے جیسا ہی کربناک تجربہ تھا۔ کھجلی جو ویسے کبھی نہ ہوتی تھی اب ہر جگہ ہوئی جا رہی تھی لیکن کہیں بھی کھجانے کی اجازت نہ تھی۔ بہرحال پندرہ منٹ کے بعد اس مشکل سے نجات ملی۔ ایک وقفہ کے بعد جب ایک بار پھر یہی معائنہ دہرایا گیا تو پھر میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا۔ دوسری بار یہ معائنہ بخیر و خوبی مکمل ہو گیا۔ سارے چیک اپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزید دو وال بند پائے گئے۔ اور اب ایک بار پھر آپریشنل پراسیس سے گزرنا ہوگا۔ گھر آ کر میں نے مبارکہ سے پنجابی میں کہا کہ ''سِر تے اک وال نئیں ریہا، تے اے ہن دل دے والاں دے دوالے ہو گئے نیں''۔ بہرحال ۳ نومبر کو ایک بار پھر دل کی انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی ہونا قرار پائی۔

میں اپنے دوست احباب کو بتا رہا تھا کہ زندگی بھر جنہیں دل کھول کر دکھانے کی حسرت رہی وہ تو پوری نہیں ہوئی، لیکن یہ لوگ نہ صرف دل میں جھانکتے رہتے ہیں بلکہ جب جی چاہتا ہے اسے کھول کر دیکھ بھی لیتے ہیں، بلکہ بار بار دیکھتے جا رہے ہیں۔ بہرحال ۳ نومبر کو یہ مرحلہ بھی خیر و خوبی سے گزر گیا۔ رات کو چھ گھنٹے سیدھے لیٹے رہنے اور دائیں ٹانگ کو بالکل نہ ہلانے کی ہدایت پر عمل کے لیے میں اس بار ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے نیند کی گولی کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر نے ڈرپ میں ہی ہلکی سی مقدار میں دوا دے دی۔ اس سے نہ تو گہری نیند آئی اور نہ ہی بے چینی والی بیداری رہی۔ نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ سو اس بار زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ جب پٹی کھولی گئی تو میں اطمینان اور آرام کے ساتھ اُٹھا۔ ہسپتال والوں کا ملنگوں والا چولا اتارا، اپنا لباس پہنا اور اس بار اپنے وارڈ کے باہر لان میں کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہسپتال سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دوسرے دن معمول کے مطابق چھٹی مل جانی تھی لیکن ایک مہینے میں دوسری بار اس مرحلہ سے گزرنے کے باعث مجھے احتیاطاً ایک دن کے لیے مزید روک لیا گیا۔ ۵ر نومبر کو چھٹی دی گئی اور میں مزے مزے سے گھر پہنچ گیا۔

پہلی بار آپریشن وارڈ سے جنرل وارڈ تک پہنچا تھا تو طارق، نازیہ اور شایان فوراً ہسپتال پہنچ گئے

تھے۔ اب دوسری بار جنرل وارڈ میں پہنچا تو مبارکہ، طارق، نازیہ اور شایان کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ دوسرے دن جب چھٹی نہیں ملی تو مبارکہ، شعیب اور عثمان ایک ساتھ ملنے آ گئے۔ اب عمر کے اس حصے میں اور بیماریوں کی اس یلغار میں مبارکہ اور میں ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ بعض عزیز اور دوست احباب ہم دونوں کی خیریت دریافت کرنے لگے تو میں نے کہا ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً میں مبارکہ سے کہتا ہوں آپ آرام سے بیٹھیں، میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔ مبارکہ جواباً کہتی ہے نہیں آپ آرام سے بیٹھیں میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ ہم دونوں کا جذبہ دیکھ کر چائے کہتی ہے آپ دونوں آرام سے بیٹھیں میں خود ہی تیار ہو کر آ جاتی ہوں۔

۱۹ر نومبر ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سانس پھولنے کا مسئلہ جوں کا توں ہے، تو اس نے کہا کہ ایک بار پھر انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔ میں نے کہا ۳ر دسمبر کے بعد کی کوئی تاریخ طے کر لیں۔ تب تک خواب کی تعبیر نہ آئی تو پھر جیسے چاہیے ہمارے دل پر مشقِ ناز فرمائیے۔

جب میرے ۳ر دسمبر والے خواب کی بات گھر کے تقریباً سارے افراد تک پہنچ گئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ خوابوں اور ان کی تعبیروں سے دلچسپی رکھنے والے بعض خاص دوستوں کو بھی خواب بتا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہالینڈ سے جمیل الرحمٰن، انگلینڈ سے نصیر حبیب اور جرمنی سے خالد ملک ساحل تین دوستوں کا بطور خاص حوالہ دوں گا۔ خالد ملک ساحل صاحب اتنے رقیق القلب نکلے کہ مجھے لگا میری فوتگی پر وہ جس طرح رونے لگیں گے، انہیں دلاسہ دینے کے لیے شاید مجھے خود ہی اٹھ کر انہیں چپ کرانا پڑے گا۔ تاہم انہوں نے تعبیر یہ کی کہ ۳ر دسمبر سے آپ کی زندگی میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا، جس میں روحانی پہلو زیادہ ہوگا۔ لگ بھگ اسی انداز کی بات نصیر حبیب صاحب نے ہنستے ہنستے اور بعض رنگین اشارے دے کر کر دی۔ جمیل الرحمٰن سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ۳ دسمبر کی تاریخ کو ایک طرف رکھیں۔ اور انّی متوفّیک کے اعداد نکالیں۔ اعداد نکالے تو ۹ نکلے۔ میں نے کہا اب تو بات واضح ہو گئی کہ ۲۰۰۰ کی صدی میں ۲۰۰۹ ایک بار ہی آنا ہے۔ اس کی دوسری تاویل کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ۲۰۰۹ء سے اگلے نو برس تک زندگی رہے گی اور ۲۰۱۸ء میں وفات ہو گی۔ اس پر جمیل الرحمٰن نے کہا کہ میرے حساب سے ۲۰۱۶ء کا سال نکلتا ہے۔ کیونکہ ۲۰۱۶ کے اعداد نو نکلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ بھی قرینِ قیاس ہے۔ جب مبارکہ کو اس حساب کتاب کا علم ہوا تو کہنے لگی کہ ۲۰۲۵ء اور ۲۰۳۴ء کے اعداد بھی

تو نو ہی نکلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صرف ۲۰۳۴ تک ہی کیوں پھر ۲۰۵۲ء کرلیں۔اس کا عدد بھی ۹ نکلتا ہے اور میری زندگی کی سنچری بھی پوری ہوتی ہے۔۹ کے پھیر میں جمیل الرحمٰن نے ڈال دیا ہے ورنہ خواب سیدھا سادہ ۳؍دسمبر ۲۰۰۹ء سے متعلق ہے۔ پورا ہوگیا تو بھی ٹھیک اور پورا نہ ہوا تو بھی خیر۔۔۔لیکن نو کے عدد سے تاویل وتعبیر کا ایک طویل تر سلسلہ بنتا جا رہا ہے۔اتنی تعبیریں یکجا ہوتی گئیں تو میرا بے چارہ خواب اپنی موت آپ مر جائے گا۔شاید دوستوں نے مجھے بچانے کے لیے یہی ترکیب نکالی ہو کہ اتنی تعبیریں اور تاویلیں جمع کر دو کہ سب کچھ خلط ملط ہو جائے۔کثرتِ تعبیر کے ہاتھوں خواب کے انجام سے مابعد جدید والوں کا ڈھکوسلہ بھی مزید سمجھ میں آتا ہے۔لیجیے صاحب معنی کو ہمہ وقت ملتوی کراتے رہیے،موت سے جان بچاتے رہیے،لیکن تابہ کے!

میں نے اپنی یادوں کے باب ’’دعائیں اور قسمت‘‘ میں بڑی وضاحت سے لکھا تھا:

’’چند قرآنی اور مسنون دعائیں مجھے بچپن میں رٹا دی گئی تھیں۔ان کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن میں جب کسی دُکھ کی حالت میں ہوتا ہمیشہ اپنی زبان میں خدا سے دعا کرتا۔ بہت بار ایسا تجربہ ہوا کہ میں نے دعا کی اور اسی حالت میں مجھے دعا کی قبولیت کا یقین بھی ہو گیا۔ جب بارہا ایسا ہوا تو میں نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کو اس بارے میں بتایا۔اس بتانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو دعا بظاہر قبول ہو چکی تھی‘ ایک لمبے وقفہ تک معلّق ہوگئی۔ دو تین بار ایسے جھٹکے لگنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قبولیت دعا کا نشان تو خدا کے مامورین اور اولیاء کے لئے مخصوص ہے۔میری کسی بھی دعا کا قبول ہونا میرا انفرادی معاملہ ہے۔اگر میں اسے دوسروں کو بتاؤں گا تو مقامِ ولایت پر قدم رکھنے جیسی جسارت کروں گا‘ جس کا میں اہل ہی نہیں۔سو اسی لئے وہ دعائیں جن کی قبولیت کے بارہ میں دوسروں کو بتا دیتا ہوں‘ لمبے عرصہ کے لئے ردّ و قبول کے درمیان معلّق ہو جاتی ہیں اور یہی میرے افشاء کی سزا ہوتی ہے۔

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے‘‘

اپنے خواب اور غنودگی کی حالت میں قرآنی الفاظ کے زبان پر جاری ہونے کے تجربہ کو قبولیت دعا سے ملتا جلتا یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔تو میں نے جو اسے مقررہ وقت آنے سے پہلے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں میں اتنا زیادہ بتا دیا ہے تو کہیں لاشعوری طور پر میں نے یہی تو نہیں چاہا کہ تین دسمبر کا سن سچ مچ معلق ہو جائے۔اور چاہے پھر بعد میں تاریخ بھی ادل بدل ہو جائے۔ بظاہر ایسا نہیں

ہے لیکن انسانی لاشعور کا کیا کہا جا سکتا ہے۔یوں بھی دل دریا سمندروں ڈوہنگے۔ مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔روح اور جسم کے حوالے سے میں اپنی بساط کے مطابق کافی کچھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں اپنی سوچ میں ہوئی پیش رفت کا ہلکا سا ذکر بھی کر دوں۔جسم اور روح لازم وملزوم ہیں۔جسم کے اندر ہی کہیں کوئی مین سوئچ ہے (جسے ابھی جدید سائنس دریافت نہیں کر پائی)۔وہ مین سوئچ آف کر دیا جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں۔جسم سے گہرے اور مستقل ربط کے باوجود مجھے روح کی ایک حد تک الگ حیثیت کا بھی پرچھائیں جیسا ادراک ہوتا ہے۔اس سے جسم کی نفی نہیں ہوتی لیکن روح جسم کے ساتھ اس سے سوا بھی ہے۔مثال کوئی بہت واضح نہیں ہے لیکن اسے کسی حد تک اور محض مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔سیٹلائٹ سے جو پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں،وہ اپنے اظہار کے لیے ٹی وی سیٹ کے محتاج ہیں۔ٹی وی کے بغیر وہ خود کو ظاہر نہیں کر سکتے،یوں ٹی وی اور سیٹلائٹ سے آنے والے پروگرام میں گہرا ربط ہے۔تاہم ٹی وی کے بغیر بے شک وہ پروگرام خود کو ظاہر نہ کر پائے لیکن وہ یہیں کہیں موجود تو ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر میرے لیے بہت سا مزید غور وفکر کا سامان موجود ہے۔تاہم اس سے روح اور جسم کے لازم وملزوم ہونے کے اس تصور کی نفی نہیں ہوتی جو میں اپنی یادوں کے باب ’’روح اور جسم‘‘ میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ نئی سوچ دراصل اسی سوچ کی محض توسیع اور اسی کے اندر ایک نئے زاویے کی دریافت کا احساس دلاتی ہے۔

بہر حال دوستوں کی تعبیروں کو بھی ایک حد تک مدنظر رکھا جائے تو اب تین امکانات ہیں،اسی سال ۲۰۰۹ء کے ۳ دسمبر کو مجھے بارگاہِ الٰہی سے بلاوا آجائے۔یا پھر ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۸ء تک اسے موخر سمجھا جائے۔ذاتی طور پر میرے دامن میں حبّ رسولؐ کے طور پر کچھ بھی خاص نہیں ہے۔ایک ہلکا سا احساس اور بس۔میں نے ایک عرصہ پہلے سے یہ خواہش کر رکھی ہے کہ میرے پاس نذر گزارنے کو اور کچھ بھی نہیں ہے سو اپنی عمر کا نذرانہ بارگاہِ رسالت میں پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ میری عمر ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرے،اس کے اندر ہی اندر کہیں بھی مکمل ہو جائے۔

بلاشبہ زندگی خدا کا عطا کردہ بہت بڑا انعام ہے،اس کے لیے خدا کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔موت بھی برحق ہے،خدا جب چاہے بلا لے،میں اس کے لیے بھی ہمیشہ اس کی رضا پر راضی اور کوچ کے لیے کمر بستہ ہوں۔بس اپنی عمر کے ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرنے کی خواہش کے پیش نظر مجھے ۲۰۱۶ء یا

۲۰۱۸ء کے مقابلہ میں ۲۰۰۹ء کا سال ہی زیادہ مناسب لگ رہا ہے۔آگے جو اس کی مرضی!

۳دسمبر ۲۰۰۹ء والی تعبیر سچ ثابت ہوگئی تو اس لیے بھی خوشی ہوگی کہ یادوں کا یہ باب چھپتے وقت پورا باب بزبانِ حال کہہ رہا ہوگا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

خواب کی تعبیر کچھ اور ہوئی یا سارا خواب ہی غلط ہوگیا تو پھر ۴ردسمبر کو ایک دو سطروں کا اضافہ کرکے یہ باب مکمل کرلوں گا۔**وما توفیقی الا باللہ**!

(یہ تحریر میں نے ۲۳رنومبر ۲۰۰۹ء کو مکمل کرلی تھی۔آج ۲۶رنومبر تک اس میں ہلکے پھلکے اضافے کیے اور آج ہی ان احباب کو ای میل سے یہ فائل بھیج رہا ہوں:شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)،محمد عمر میمن (امریکہ)،شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)،منشا یاد(اسلام آباد)،ایوب خاور (کراچی) ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)،جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)،خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)، خالد ملک ساحل (جرمنی)، شبانہ یوسف (انگلینڈ)،ارشد خالد (اسلام آباد)،احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)،سلیمان جاذب (دبئی) ۔ح۔ق) ۲۸نومبر کو یہ فائل سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)،عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی (کینیڈا) کو بھی بھیج دی گئی۔

۴ردسمبر کو لکھا جانے والا اضافی نوٹ:

اس وقت جرمنی کے وقت کے مطابق رات کے بارہ بج کر سات منٹ ہو چکے ہیں، ۳ردسمبر ۲۰۰۹ء گزر چکا ہے،۴ردسمبر کا دن شروع ہو چکا ہے۔ویسا کچھ نہیں ہوا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔لیکن منشا یاد کے افسانہ ''بیک مرر'' کے اختتام کے مطابق ایسا ہوتو سکتا تھا۔(ح۔ق)

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔جنوری ۲۰۱۰ء

جدید ادب جرمنی۔شمارہ:جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء

''کھٹی میٹھی یادیں'' کا ایک باب

زندگی دَر زندگی

یادوں کے گزشتہ باب **لبیک اللھم لبیک** کی اشاعت کے بعد میرے قریبی دوست احباب نے میرے ۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء والے خواب اور اس کی ممکنہ تعبیر کے سلسلے میں مزید اپنی اپنی رائے سے نوازا ہے۔بعض تاثرات دوستوں اور بزرگوں کی محبت یا ہمدردی پر مبنی ہیں۔بعض تاثرات میں خواب کو واہمہ جیسا سمجھا گیا ہے اور مجھے بھی یہی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)،محمد عمر میمن (امریکہ)،شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)،اشعر نجمی (تھانے)،سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)،منشا یاد(اسلام آباد) وغیرہ اسی زمرہ میں آتے ہیں۔البتہ ان میں سے منشا یاد نے تو کسی حد تک غصہ کرکے میری توجہ موت کے احساس سے ہٹانا چاہی جبکہ شمیم حنفی نے میری تحریر کو ادبی طور پر بہت پسند کرتے ہوئے مجھے مزید لکھنے کی تحریک کی۔ایوب خاور (کراچی)،خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)، شبانہ یوسف (انگلینڈ)،ارشد خالد (اسلام آباد)،عبدالرب استاد (گلبرگہ)،احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)،عظیم انصاری (کلکتہ) ان احباب نے تو بہت زیادہ جذباتی جوش کے ساتھ میرا خیال رکھا۔ان میں سے بیشتر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔پروین شیر (کینیڈا)،شہناز خانم عابدی (کینیڈا)، ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)، سلیمان جاذب (دبئی)،بشریٰ ملک (جرمنی) وغیرہ احباب جیسے درازیٔ عمر کی دعا میں مشغول ہو گئے۔ جوگندر پال جی کا ٹیلی فون آ گیا،دیر تک باتیں کرتے رہے۔میرا حوصلہ بڑھاتے رہے،تحریر کی سچائی پر داد دیتے رہے۔میں نے انہیں کہا کہ یہ آپ کے ''خود وفاتیہ'' طرز کی تحریر ہے،کہنے لگے:تمہاری واردات بہت گاڑھی ہے۔بعض احباب نے خواب کا غلط ہونا قرار دیا ہے تو بعض نے اس کی تاویل کرکے تعبیر کسی اور زاویے سے دیکھی ہے۔مذکورہ بالا احباب کے تاثرات اگر یکجا کرنے بیٹھوں تو پورا ایک باب بن جائے گا،لیکن ظاہر ہے وہ سارا میٹر ان کی میرے تئیں محبت اور ہمدردی کا غماز ہے اس لیے اسے یہاں درج کرنے کی بجائے ذاتی ریکارڈ میں ہی سنبھال رکھتا ہوں۔

تین تاویلیں ایسی ہیں کہ میں انہیں یہاں درج کرنا چاہوں گا۔میرے ماموں صادق باجوہ کا کہنا

ہے کہ خواب میں موت سے مراد لمبی عمر ہے۔ میرے خیال میں خواب میں کسی زندہ انسان کی موت کی خبر ملنا یا اسے مردہ دیکھنا تو اس کی لمبی عمر کی علامت ہوسکتی ہے لیکن اس طرح معین تاریخ وفات کی خبر سے مراد لمبی عمر شاید نہیں بنتی۔ باقی واللہ اعلم۔

کینیڈا سے عبداللہ جاوید صاحب کی تاویل مجھے مزے کی لگی۔ ان کے بقول: جیسے کسی بچے کو کسی شرارت یا کام سے روکنے کے لیے کسی تاریک کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر دکھایا جائے اور پھر دروازہ بند کر کے بچے کو ڈرایا جائے کہ اگر تم شرارت سے باز نہ آئے تو تمہیں اس کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح ۳ دسمبر کی تاریخ بتا کر اللہ میاں نے موت کے تاریک دروازے کا ڈراوا دیا تھا۔ لیکن یہ ضدی بچہ شرارت کو چھوڑ کر دروازے کے اندر میں دلچسپی لینے لگا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا کہ شرارت ورارت کا معاملہ چھوڑیں یہ دروازہ کھولیں مجھے اس کمرے میں جانا ہے۔ دیکھوں تو سہی اندر کیا ہے۔ جب دروازہ نہیں کھلا تو ۲۶ نومبر آنے تک اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا، اور پھر ۲۶ نومبر سے ۳ دسمبر تک اس بچے نے دروازہ کھٹکھٹانا اور شور مچانا جاری رکھا۔

ایک طرف تعبیر و تاویل کا یہ سلسلہ تھا دوسری طرف بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ خواب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس پر میری اہلیہ مبارکہ نے بڑی انوکھی نشان دہی کی۔ مبارکہ کی تاویل بیان کرنے سے پہلے دو وضاحتیں کر دوں۔ پہلی وضاحت: اپنے قریشی ہونے کی نسبت سے، اپنی تمام تر کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود میں خود کو ہمیشہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی آل میں شمار کرتا ہوں۔ مجھے گہرا احساس ہے کہ روحانی سطح پر مجھ خاک کی اُس عالمِ پاک سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ پر کچھ ہے تو سہی۔ دوسری وضاحت: خواب کی تعبیر و تاویل میں جو ایک مماثلت کا بیان آگے آنے والا ہے، وہ صرف خواب کی تفہیم کے سلسلہ میں ایک مثال کے طور پر ہے، وگرنہ میں ابراہیمی سمندر کے سامنے ایک قطرہ اور صحرا کے سامنے ایک ذرہ جتنی وقعت کا بھی حامل نہیں ہوں۔ یہ وضاحت اس لیے نہیں کر رہا کہ کوئی مذہبی انتہا پسند میری بات سے کوئی اشتعال انگیزی نہ کر گزرے۔ بلکہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اس اظہار کے نتیجہ میں کہیں میرے اپنے اندر کوئی فتور نہ آ جائے۔ بس میری یہ تحریر مجھے میری اوقات کا احساس دلاتی رہے۔

ان وضاحتوں کے بعد مبارکہ کی بیان کردہ تعبیر و تاویل پیش کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو اپنا خواب بتایا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً خواب کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اب

صورتحال یہ بنی کہ باپ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور بیٹا قربان ہونے کو تیار ہے۔ جب خدا نے دیکھا کہ باپ بیٹا دونوں اس کی رضا پر راضی اور اس کے حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہیں تو قربانی کے حکم کے باوجود ذبح کرنے سے روک دیا گیا اور خواب کی تعبیر مینڈھا بھیج کر پوری کر دی گئی۔ یوں خواب دوسرے رنگ میں پورا ہو گیا۔

میرے خواب میں ایک معیّن تاریخ وفات کی خبر کے بعد میری طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی موت کا ڈر یا خوف پیدا نہیں ہوا۔ اسی برس پے در پے دہلا دینے والے سانحات نے بھی مجھے کسی یاس انگیز کیفیت میں نہیں جانے دیا۔ **لبیک اللھم لبیک** میں جتنا میں ہشاش بشاش ہوں اتنا ہی میں گزشتہ برس اپنی زندگی میں ہشاش بشاش رہا اور ۳ دسمبر کا وعدۂ وصل کی طرح انتظار کرتا رہا۔ میری اس کیفیت کو میرے وہ تمام عزیز اور احباب بخوبی جانتے ہیں جو گزشتہ برس میرے ساتھ مسلسل رابطہ میں رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خدا نے یہ خواب دکھایا تھا اور جو ہمارے دلوں کے بھید ہم دل والوں سے بھی زیادہ جانتا ہے، وہ بخوبی جانتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں کس حد تک راضی برضا ہو گیا تھا۔ سو موت کی خبر پا کر اس کے لیے کسی خوف کے بغیر آمادہ ہو جانے کی سال بھر کی کیفیت کو دیکھ کر میرے خدا نے بھی ۳ دسمبر کی تعبیر کسی اور رنگ میں بدل دی۔ کس رنگ میں بدلی؟ یہ ابھی تک مجھے بھی علم نہیں ہے۔

کچھ عزیزوں نے کہا کہ اللہ کے نیک بندوں پر بیماریوں کی یلغار کی صورت میں ابتلا اور آزمائش آتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں ان بلاؤں کے آنے پر شاکی نہیں ہوں لیکن خدا کی قسم میں اللہ کا نیک بندہ نہیں ہوں، اس کا گنہگار بندہ ہوں۔ ایک کرم فرما نے فرمایا کہ یہ گناہوں کی سزا ہے۔ میں نے کہا میری گناہوں کے سلسلہ میں اپنی ایک سوچ ہے۔ میں تکبر، رعونت، فرعونیت خواہ وہ کسی صورت میں ہو اس لعنت سے ہمیشہ بچتا ہوں۔ ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے کسی کی بے جا تذلیل نہ ہو جائے۔ کسی کی زیادتی کا بدلہ ضرور لیتا ہوں لیکن اس زیادتی کے برابر، پوری طرح ناپ تول کر۔ میرے نزدیک تکبر، رعونت اور فرعونیت چاہے کسی رنگ، روپ اور بہروپ میں ہو۔۔ سب سے بڑا گناہ ہے۔ ریاکاری والی انکساری بھی ایسا ہی بہروپ ہے جس کے عقب میں تکبر موجود ہوتا ہے۔ سو میں ان سب کے ارتکاب سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں اور بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس گناہِ عظیم سے ہٹ کر جہاں تک بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا کی بات ہے تو اگر یہ بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا ہے تو بہت کم ہے، بہت ہی کم ہے، اتنی کم ہے کہ سزا لگتی ہی نہیں کیونکہ بشری کمزوریوں والے میرے گناہ تو بے شمار ہیں۔

دسمبر ۲۰۰۹ء گزر گیا تو نئے سال کا استقبال اپنے معمول کے مطابق کیا۔ پاکستان سے ہی میرا معمول رہا ہے کہ میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ کسی چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر مصلّیٰ بچھا لیتا ہوں۔ گزرے ہوئے سال کا ایک جائزہ اپنے اندر لیتا ہوں۔ کہیں استغفار کرتا ہوں تو کہیں شکر گزار بنتا ہوں۔ آنے والے سال کے سلسلہ میں اپنی دعائیں بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے تک یا ساڑھے بارہ بجے تک میں اسی طرح نئے سال کا استقبال کرتا ہوں۔ اسے میں اللہ میاں سے اپنی سالانہ ملاقات بھی سمجھتا ہوں۔

۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کا جو مرحلہ ملتوی کر دیا گیا تھا وہ گیارہ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہونا طے پایا۔ گیارہ جنوری کو انجیو گرافی کی گئی لیکن کسی ٹیکنیکل مسئلہ کی وجہ سے انجیو پلاسٹی کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے دو گھنٹے تک زیرِ نگرانی رکھنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انجیو پلاسٹی کے لیے ۲۱ جنوری کی تاریخ طے کر دی گئی۔ مجھے ایک دن پہلے یعنی ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں آ کر داخل ہونا تھا۔ سو ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جب گھر سے روانہ ہوا، اور وہاں سے سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ایک کوئے یار سے دوسرے کوئے یار میں آ نکلا۔ منجھلا بیٹا عثمان مجھے ہسپتال تک پہنچا گیا تھا۔ بار بار آنے جانے کی وجہ سے بادزودن ہسپتال کے کارڈیو ڈیپارٹمنٹ میں اب کافی جان پہچان ہو گئی ہے۔ پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۹ میں میرا بیڈ تھا۔ پہلے نرس آئی اور شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر گئی۔ پھر نیپالی ڈاکٹر مایا آئی۔ اس نے سر سے معائنہ شروع کیا۔ آنکھ، منہ اور گلے کو ٹٹول کر چیک کرتے ہوئے جب پیٹ تک آئی تو پیٹ کو دباتے ہوئے پوچھنے لگی کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا صرف گیس کی تکلیف ہے۔ ڈاکٹر تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر پیٹ کے دائیں بائیں جانب سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دباتے ہوئے پوچھا درد تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا گدگدی ہو رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر جو ابھی تک مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی ظاہر کر رہی تھی، اب زور سے ہنسنے لگی، گویا میرے حصے کا بھی ہنس دی۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر چہل قدمی کے لیے نکلا۔ پھر اپنے کمرے اور وارڈ سے باہر لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات کو گھر والوں سے بات ہوئی۔ پھر ایک غزل شروع ہو گئی۔ رات گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

۲۱ جنوری کو فجر کی نماز سے فارغ ہوا تو ٹیپو آ گیا۔ میرے استعمال کی چند چیزیں جو گھر پر رہ گئی تھیں دینے آیا تھا۔ وہیں سے پھر اپنی جاب پر چلا گیا۔ صبح ناشتہ سے پہلے میری شوگر ۱۶۹ تھی۔ ناشتہ کے بعد یکدم

۳۶۹ ہو گئی۔ اس پر فوراً انسولین کا ٹیکہ لگایا گیا۔ ٹیکہ لگوا کر میں اپنے کاغذ قلم لے کر لابی میں چلا گیا۔ (لیپ ٹاپ کی سہولت ہوتی تو کاغذ قلم کی ضرورت نہ پڑتی) شام کو ساڑھے چار بجے انجیو پلاسٹی کا وقت طے تھا۔ اس دوران مبارکہ سے فون پر بات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ کل رات کو کینیڈا سے پروین شیر نے فون کر کے خیریت دریافت کی تھی۔ آج دن میں ارشد خالد اور نذر خلیق کے فون آئے تھے اور دونوں خیریت دریافت کر رہے تھے۔ مبارکہ کے فون کے بعد اپنے اپنے گھر سے سارے بچوں نے بھی فون کر کے خیریت دریافت کی۔

آج ڈاکٹر ویسنا چیک اپ کے لیے آئیں۔ ٹمپریچر، نبض، بلڈ پریشر سب نارمل تھے۔ بلڈ پریشر ۸۰۔۱۴۰ تھا۔ ڈاکٹر ویسنا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بیڈ پر بہت زیادہ جھک آئی تھیں، شاید اسی لیے بلڈ پریشر ۱۲۰ کی بجائے ۱۴۰ ہو گیا تھا۔ بہر حال سب کچھ کنٹرول میں تھا۔ شام کو انجیو پلاسٹی بھی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آ گیا اور ٹانگ سیدھی رکھنے والی تکلیف کا مرحلہ بھی نسبتاً آسانی سے گزر گیا۔ ۲۲ جنوری کو صبح سویرے میرا ای سی جی ٹیسٹ ہوا۔ رپورٹ اطمینان بخش تھی۔ اسی روز میں نے دو غزلیں کہیں۔ شام تک مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

۱۸ فروری کو چیک اپ ہوا۔ اس کے بعد ۱۲/اپریل کو پھر معائنہ کیا گیا۔ یہ معمول کے چیک اپ ہیں۔ ہماری بیماریوں کے معاملہ میں ہم سے زیادہ ان لوگوں کو فکر رہتی ہے۔ اسی دوران میری پوتی ماہ نور نے بھی قرآن شریف ختم کر لیا۔ ۲۶ فروری کو اس کی آمین کی تقریب ہم سب نے اہتمام کے ساتھ کی۔ اب تک میرے دو نواسوں مشہود (رومی) اور مسرور (جگنو) نے، دو پوتوں شہریار (شہری) اور جہاں زیب (سونو) نے اور دو پوتیوں ماہ نور (ماہا) اور علیشا (ایشا) نے قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیا ہے اور ان سب کی تقریب آمین ہو چکی ہے۔ یہ ان بچوں کی ماؤں کا اعزاز ہے کہ انہوں نے جرمنی میں رہتے ہوئے بھی بچوں کو اوائل عمری میں ہی نہ صرف قرآن شریف پڑھنا سکھا دیا بلکہ اس کی تلاوت کی عادت بھی قائم کر رہی ہیں۔ **فالحمد للہ!**

مبارکہ کا ہفتہ میں تین بار ڈائلسز کا سلسلہ جاری ہے اور اب ایک طرح سے معمولاتِ زندگی میں شامل ہے۔ ۱۶، ۱۷/اپریل کی درمیانی رات اسے بے چینی ہونے لگی۔ شوگر اور بلڈ پریشر چیک کیے تو سب نارمل تھے البتہ نبض کی رفتار مدھم تھی۔ ۴۰ سے ۴۳ کے درمیان۔ دو اڑھائی گھنٹے اپنے ٹوٹکے کرنے میں گزار دیئے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے بڑے بیٹے کے گھر فون کیا۔ تسنیم سے بات ہوئی۔ اس نے فوراً قریبی شہر

ہوف ہائم کے ہسپتال میں فون کیا۔ چھ بجے وہاں کا ڈاکٹر ہمارے گھر پہنچ گیا۔نبض کے بارے میں جان کر اس نے دستی ای سی جی مشین بھی ساتھ رکھ لی تھی۔مبارکہ کی صورتحال دیکھ کراس نے گھر پر ہی ای سی جی ٹیسٹ شروع کر دیا۔دل میں گڑ بڑ ہونے کے سگنل مل رہے تھے۔ساڑھے چھ بجے اس نے ایمبولینس بلا لی۔ایمبولینس والوں نے آتے ہی اپنی کاروائی شروع کر دی۔وہ اسٹریچر پر ڈال کر لے جانا چاہتے تھے۔ہم اپنی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر رہتے ہیں۔میرے پاس ہاؤس ماسٹر کا فون نمبر نہیں تھا۔ہاؤس ماسٹر سے سارے معاملات چھوٹا بیٹا ٹیپو خود ڈیل کرلیا کرتا ہے۔ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ لفٹ کی چابی منگائیں تا کہ مریضہ کو اسٹریچر پر ہی لے جایا جا سکے۔میں نے ٹیپو کے گھر فون کیا،موبائل پرفون کیا،مگر سارے فون بند تھے۔پانچ منٹ کا پیدل رستہ ہے اس دوران میں نے خود جا کراس کے گھر پر بیل دی اور پیغام دیا کہ فوراً ہمارے ہاں پہنچو۔ان لوگوں کے پوری طرح بیدار ہونے ،تیار ہونے اور ہمارے ہاں پہنچنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ تب تک ڈاکٹرز مزید انتظار کیے بغیر مبارکہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہی لے گئے۔تینوں بیٹے ہمارے گھر کے اتنے قریب ہیں کہ کسی ایمرجنسی میں بلانے پر پانچ منٹ کے اندر گھر پر پہنچ سکتے ہیں۔ہر چند آج بڑی بہو تسنیم کو جتنا کام سونپا گیا اس نے احسن طریقے سے کر دیا اور اسی کے نتیجہ میں ڈاکٹر اور ایمبولینس بروقت پہنچ چکے تھے۔لیکن آج ایمرجنسی میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ سب سے قریب مقیم بیٹا اس وقت ہم تک پہنچا جب اس کے آنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔اس سے اندازہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے آسانی ہو تو دور والے بھی قریب ہیں اور اگر الجھن پیدا ہونی ہے تو سب سے قریب والے بھی دور ہیں۔سبق ملا کہ بچوں کی سعادت مندی پر ان کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے لیکن بھروسہ صرف اور صرف اپنے خدا پر ہی رکھنا چاہیے۔اس کا فضل ہے تو ہر طرف سے ہر طرح خیر ہے۔

ساڑھے سات بجے ایمبولینس والے مبارکہ کو ساتھ لے کر گئے تھے اور ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مبارکہ کا فون آ گیا کہ انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے دونوں مرحلے طے ہو گئے ہیں۔گویا اب ہم دونوں میاں بیوی ہارٹ کلب کے ممبر بن گئے ہیں۔میں نے تو مبارکہ کی کسی بیماری میں شراکت نہیں کی لیکن وہ میرے دل کی بیماری میں حصہ دار بن گئی۔اگلے دن اس کے ڈائلسز کی باری تھی۔۲۳اپریل کو شام تک ڈائلسز کے بعد مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

۲۴/اپریل کو ہمارے شہر کی میئر شپ کی ایک امیدوار محترمہ کارین کے ساتھ مقامی کمیونٹی سنٹر میں ملاقات طے ہوئی تھی۔ان کا تعلق ایف ڈی پی سے ہے۔جب کمیونٹی سنٹر میں پہنچیں تو بالکل

اکیلی۔۔۔مجھے اس لیے حیرانی ہوئی کہ ہمارے ہاں تو یونین کونسل کے امیدوار بھی ڈھول،باجے کے ساتھ آتے ہیں۔یہ تو شہر کی بلدیہ کی میئر شپ کی امیدوار تھیں اور بالکل اکیلی۔انہوں نے ماضی میں اپنی سماجی سرگرمیوں کی تفصیل سے آگاہ کیا اور مستقبل کے ارادوں (صرف وعدوں کا نہیں ارادوں) کا ذکر کیا۔ماضی کی سرگرمیوں میں انہوں نے بتایا کہ وہ نوجوانوں کی بہتری کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔میں نے انہیں تجویز دی کہ اس بار آپ بڑی عمر کے لوگوں کے لیے بھی کچھ کام کرنا۔میری تجویز انہوں نے پرزور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لی۔جاتے ہوئے مجھے اپنا ای میل ایڈریس دے گئیں۔میں نے اسی دن شام کو انہیں ایک ای میل بھیج دی جس میں اپنے تعارف کے طور پر اپنی نظم ’’سرسوں کا کھیت‘‘ کا جرمن ترجمہ بھی نتھی کر دیا۔ان کی جوابی میل آئی جس میں نظم پر پسندیدگی کا رسمی اظہار تھا۔اگلے دن ۲۵اپریل کو انتخاب تھا۔ہمارے ووٹ پڑنے کے باوجود محترمہ ہار گئیں۔تب میں نے انہی حوصلہ بڑھانے والی ایک میل بھیجی۔اس کا جواب بڑا دلچسپ آیا۔انہوں نے لکھا کہ ہارنے کے باوجود ہم لوگ پُرعزم ہیں۔ہار کی خبر سننے کے بعد پارٹی کے مقامی رہنما اور کارکن ایک جگہ جمع ہوئے۔وہاں میں نے بطور خاص آپ کی ای میل کا ذکر کیا اور آپ کی نظم ’’سرسوں کا کھیت‘‘ پڑھ کر سنائی،جسے حاضرین نے اس خاص کیفیت میں بطور خاص پسند کیا۔

اس سال فروری کے مہینے میں امریکہ سے ستیہ پال آنند کی ای میل آئی کہ میں یورپ کا سفر کرنے والا ہوں۔ان کے ساتھ گزشتہ برس ایک علمی مجادلہ میں ہلکی سی تلخی ہوئی تھی۔میں نے جوابی کاروائی میں ان کی متعلقہ ای میلز شائع کر کے انہیں علمی واخلاقی دونوں سطح پر خاموش کر دیا تھا۔یہ ساری روداد میری کتاب ’’ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت‘‘ میں محفوظ ہے۔اس سب کچھ کے باوجود ان کی ای میل آئی تو کچھ اچھا سا لگا۔سو میں نے انہیں لکھا کہ جب یورپ آ رہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔ڈاکٹر آنند فوراً راضی ہو گئے۔مجلسی سرگرمیوں سے تمام تر بے رغبتی کے باوجود اب مجھے ایک تقریب کا اہتمام تو کرنا تھا۔اسی دوران فرینکفرٹ کے ایک متشاعر سے بات ہو رہی تھی تو اس نے کہا کہ آپ کو تو تقریبات کرانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے پھر کیسے انتظام کریں گے۔میں نے کہا میں جان بوجھ کر ان سرگرمیوں سے پرہیز کرتا ہوں وگرنہ ان کا برپا کرانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔چنانچہ ۲۴مارچ کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیرصدارت ڈاکٹر آنند کے اعزاز میں تقریب کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔تقریب کے بعد ڈاکٹر آنند کوئی رسمی شکریہ کہنا تو کجا،مجھے خدا حافظ کہے بغیر روانہ ہو گئے۔اگلے روز

انہوں نے ہمبرگ میں کسی خاتون کی شاعری کی ایسی کتاب کی تقریب رونمائی کرنی تھی جو شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔۲۳ مارچ کی رات جب ڈاکٹر آنند میرے ہاں مقیم تھے وہ دیر تک اس خاتون کی شاعری کے مسودے پر اصلاح کا نیک فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔ میں نے تب ہی انہیں دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ کتاب کی اشاعت کے بغیر رونمائی کے ڈرامہ میں شریک ہوئے تو وہ ایک ادبی جرم کے مرتکب ہوں گے۔لیکن انہیں اس تقریب میں شرکت کی جلدی تھی سو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی ملے بغیر چلے گئے۔امریکہ واپس پہنچنے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی رسمی ای میل تک نہیں ملی۔شاید یہ ادبی تہذیب کا کوئی مابعد جدید رویہ ہو۔

اسی تقریب کے سلسلہ میں ایک اور لطیفہ در لطیفہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے ایک خاتون صدف مرزا کا حوالہ دیا کہ میرے سفر کے جملہ امور کو وہی دیکھیں گی۔ان کا تعارف بطور شاعرہ کرایا گیا۔سوانہیں بھی مدعو کرلیا گیا۔پھر ان خاتون نے پاکستان سے آئے ہوئے ایک شاعر باقر زیدی کا بتایا تو انہیں بھی مدعو کرلیا گیا۔تقریب سے پہلے ہی کھل گیا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی متعارف کرائی گئی خاتون کا جو شعری مجموعہ چھپ چکا ہے بے وزن شاعری پر مشتمل ہے۔اب صبر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔البتہ اس صبر میں یہ اطمینان شامل کرلیا کہ اس تقریب میں اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔ مجھے ویسے بھی مشاعرہ بازی کا شوق نہیں ہے،سو یہ طے کرلیا کہ میں اپنی ہی اس تقریب میں کلام نہیں سناؤں گا۔ پروگرام سے چند دن پہلے معلوم ہوا کہ پاکستان سے جو شاعر آئے ہوئے ہیں وہ کسی ٹی وی چینل سے وابستہ ہیں اور پروگرام کی ریکارڈنگ بھی کی جائے گی۔مجھ سے دو دوستوں نے پوچھا اب تو ٹی وی چینل کی طرف سے ریکارڈنگ بھی ہوگی،تو اب تو کلام سنائیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے لیے بے معنی بات ہے۔ چنانچہ تقریب ہوئی، ریکارڈنگ دھوم دھام سے ہوئی لیکن اسٹیج سیکریٹری ہونے کے باوجود میں نے کلام نہیں سنایا۔ بعد میں لطیفہ یہ ہوا کہ مجھے مذکورہ پاکستانی شاعر کی طرف سے پیغام بھیجا گیا کہ اس تقریب کی ریکارڈنگ کی ڈی وی ڈی کی ماسٹر کاپی لینا چاہیں تو سات سو یورو کا خرچہ دینا ہوگا۔میں نے پیغام پہنچانے والے دوست (ڈاکٹر وسیم) کو جواب دیا کہ پاکستانی دوست کی جیب کٹ گئی ہو اور اسے کرایا کے لیے ہیلپ کی ضرورت ہو تو کوئی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اس ڈی وی ڈی کے لیے میں سات یورو دینے کے لیے بھی راضی نہیں ہوں۔جس ریکارڈنگ کے لیے میں نے کلام سنانے میں بھی دلچسپی نہیں لی مجھے اس کی ڈی وی ڈی میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔وہ دوست سات سو سے کم کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ میں

سات یورو دینے سے بھی انکار کر چکا ہوں تو آپ کیا بھاؤ تاؤ کررہے ہیں۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

اسی دوران بون میں بشریٰ ملک نے ایک ادبی تنظیم اردو سوسائٹی آف یورپ قائم کی اور ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء کو وہاں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔اس کی صدارت مجھ سے کرائی گئی۔ میں نے بعد میں بشریٰ ملک کو مشورہ دیا کہ الم غلم قسم کے شاعراورشاعرات کا مجمع لگانے سے بہتر ہے کہ کوئی سلیقے کی ادبی تقریب کی جائے۔انہوں نے اس سلسلے میں مشورہ مانگا تو میں نے کہا کہ فضول شاعروں اور متشاعروں کی بجائے ایک دو اچھے شاعر بلائیں،ایک افسانہ نگار بلائیں،ایک خاکہ نگار۔۔۔اس طرح چار پانچ ادبی اصناف کے مختلف افراد کو بلا کر ان سب سے باری باری سنا جائے۔ پھر ان ساری پڑھی گئی تخلیقات پر گفتگو کی جائے۔حاضرین کو مجمع میں بیٹھ کر نہیں بلکہ اسٹیج پر بلا کر اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔اس طرح حاضرین براہ راست اس پروگرام میں شریک ہوسکیں گے۔میری تجویز بشریٰ ملک کو اچھی لگی۔اب دیکھتے ہیں وہ کس حد تک اس کو کر پاتی ہیں۔

اس عرصہ میں اٹلی میں مقیم پاکستانی دوست جیم فے غوری جو میرے لیے ادبی محبت اور اخلاص کے جذبات رکھتے ہیں،انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ اٹلی میں تین روزہ سیمینار کرنا چاہتے ہیں۔موضوع ہے ’’مغربی دنیا میں اردو کی صورتحال‘‘۔۲۱ تا ۲۳ جولائی کو سیمینار ہوگا۔۲۴ جولائی کو سوئٹزرلینڈ لے جائے جائیں گے،وہاں شام کو ایک مشاعرہ ہوگا اور وہاں کی سیر بھی ہوگی۔۲۶ تا ۲۸ جولائی اٹلی کی سیر ہوگی۔ گویا آٹھ دن کا ادبی وتفریحی پروگرام ہوگا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس تقریب میں روایتی مشاعرہ باز اور کانفرنس باز ادیبوں کو بالکل نہیں بلائیں۔ان جینوئن لوگوں کو بلائیں جو مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے منتظمین کے پیچھے پاگلوں کی طرح نہیں بھاگتے۔ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک میرے مشورے کو قبول کیا۔ پھر انہوں نے جو پروگرام بنایا اس میں ایک آدھ کو چھوڑ کر تقریباً ہر نشست کی صدارت پر مجھے بٹھا دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ مناسب نہ ہوگا، ویسے بھی پاکستان میں آج کل صدرِ مملکت کے ساتھ مختلف ادارے اور پارٹیاں مل کر جو کچھ کر رہی ہیں اس کے بعد تو لفظ صدر سے ہی وحشت ہونے لگی ہے چاہے وہ کسی ادبی نشست کا صدر ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ پھر میں نے اوکھے سوکھے ہو کر دو نشستوں کی صدارت قبول کی اور باقی کے لیے خود سے زیادہ بہتر اور موزوں افراد کے نام دے دیئے۔جیم فے غوری نے ۲۹ مئی کو میری ائر ٹکٹ بنوا کر مجھے بھیج دی۔لیکن اسے قسمت کی

بات سمجھیں کہ محکمہ صحت کی طرف سے انہیں دنوں میں میری Rehabilitation کے لیے منظوری آ گئی۔لوگ اس کے لیے لمبی لائن میں لگ کر باری کا انتظار کرتے ہیں مجھے اتنی جلدی اس کا چانس مل گیا جسے ضائع کرنا اپنی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔یہ ایک طرح سے فائیو سٹار ہوٹل جیسا صحت افزا مقام ہوتا ہے۔جہاں مریض کی دیکھ بھال ، دواؤں کی تبدیلی کے ٹیسٹ ،مساج وغیرہ یعنی مریضوں کو ہر طرح کا ممکنہ عیش و آرام فراہم کیا جاتا ہے جو کامل شفایابی کے لیے ممد ہوتا ہے۔سو میں نے بڑے ہی بوجھل دل کے ساتھ غوری صاحب کو ۲۱ جون ۲۰۱۰ء کو اس کی اطلاع دی۔۲۲رجون کو میری دائیں آنکھ کا موتیا کا آپریشن ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے بالکل کامیاب رہا۔یہ آپریشن گزشتہ برس اپریل سے موخر ہوتا چلا آرہا تھا اور میرے لیے یہ تاخیر کسی حد تک تکلیف دہ ہونے لگی تھی۔خدا کا شکر ہے کہ یہ کام خیر و خوبی سے انجام پذیر ہوگیا اب میں دونوں آنکھوں سے پوری طرح کام لے سکوں گا۔

۲۱ جون کو ہی مجھے پاکستان سے ڈاکٹر نذر خلیق نے بتایا کہ خیر پور میرس یونیورسٹی کے اردو مجلّہ ''الماس'' میں میرا مضمون ''ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتھ'' شائع ہوا ہے۔ڈاکٹر یوسف خشک جو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے سربراہ ہیں، چند برس پیشتر جرمنی میں آئے تھے۔ایک علمی و تحقیقی منصوبہ کے سلسلہ میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ان کا قیام تھا۔تب ان کے ساتھ ملاقاتیں ہوئی تھیں۔یہ اتفاق ہے کہ میرے اور ان کے تعلق میں جرمنی کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے۔انہوں نے یونیورسٹی کے مجلّہ میں جو مضمون شائع کیا وہ جرمن ناولسٹ ہرمن ہیسے کے ایک اہم ناول کے مطالعہ پر مبنی ہے۔اٹلی کا پروگرام چھوڑنے کی بوجھل کیفیت میں اس خبر نے کچھ سکون سا دیا، ڈاکٹر یوسف خشک کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور ان کی محبتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔لیکن محبت تو جیم فے غوری بھی بہت کرتے ہیں۔یوں میں دیر تک اداسی اور خوشی کی ملی جلی کیفیات میں گھرا رہا۔اٹلی کے اتنے اچھے ادبی پروگرام کو مس کرنے کے ساتھ مجھے اٹالین کھانوں سے محرومی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

کھانے پینے کے ذکر سے خیال آیا، جرمنی میں رہتے ہوئے ہم لوگ پاکستانی کھانے ہی کھاتے رہے ہیں۔لیکن اب کھانے کے معمولات میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ناشتہ میں ہم میاں بیوی اپنی اپنی پسند کی بریڈ لیتے ہیں۔دوپہر کو پاکستانی کھانا ہوتا ہے۔مبارکہ شام کو بھی پاکستانی کھانا کھاتی ہے لیکن میں نے شام کو بریڈ لینا شروع کر دی ہے۔ویسے پاکستانی کھانوں میں عام گوشت، سبزی اور دال کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار چپلی کباب، نہاری اور پائے کی بد پرہیزی بھی کر لیتے ہیں۔ویسے آجکل ہماری پسندیدہ ڈش گڑ کے

چاول ہے، اگرچہ یہ بچپن کی پسندیدہ ڈش کے طور پر بہت کچھ یاد دلاتی ہے لیکن اس میں ہر طرح کے میوہ جات کی شمولیت بہت کچھ بھلا بھی دیتی ہے۔کبھی کبھار یہ ڈش بنتی ہے تو میں جی بھر کے بد پرہیزی کر لیتا ہوں۔شوگر کا مریض ہونے کی وجہ سے عام طور پر تشویش تب ہوتی ہے جب شوگر معمول سے بڑھ جاتی ہے۔تاہم حالیہ دنوں میں وقفہ وقفہ سے تین بار ایسا ہو چکا ہے کہ میری شوگر بہت کم ہوگئی۔۵۰ کے لگ بھگ۔پہلی بار تب اس کا انکشاف ہوا جب میں وضو کر رہا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگیں۔شوگر چیک کی تو پچاس۔فوراً احتیاطی تدابیر بروئے کار لائے اور شوگر لیول نارمل ہوگیا۔جب وقفہ وقفہ سے تین بار ایسا ہوا تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ڈاکٹر فکرمند ہوا اور کہنے لگا اس میں خطرہ زیادہ ہے، خصوصاً نیند میں ہی شوگر لیول اتنا گر جائے تو بندہ سویا ہوا ہی آگے نکل جائے گا۔اس کے لیے خود ہی الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔لیکن مجھے تو اس مسئلہ میں بھی ایک دلکشی دکھائی دی ہے۔موت برحق ہے۔ایک نہ ایک دن آنی ہے اور میں اس سلسلہ میں اپنی خواہش پہلے سے لکھ چکا ہوں۔

''مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔''

تو اس لحاظ سے نیند میں شوگر لیول کا بہت زیادہ کم ہو جانا اس خواہش کی تکمیل کے لیے ممد ہوسکتا ہے لیکن صرف تب جب خدا کی طرف سے بلاوے کا اصل وقت آئے گا۔اس برس پاکستان سے محمد حامد سراج کی اوپن ہارٹ سرجری کے بعد ایک ای میل آئی تو اس میں موت کے خوف کا احساس نمایاں تھا۔میں نے انہیں اپنی یادوں کے گزشتہ باب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہمت افزا ای میل بھیجی جس کا پھر اچھا جواب آیا۔بے شک انجیو پلاسٹی کے مقابلہ میں اوپن ہارٹ سرجری زیادہ نازک معاملہ ہے لیکن کامیاب آپریشن کے بعد بندہ جیسے جوان ہو جاتا ہے۔میرا خود اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر کے ساتھ یہی مسئلہ چل رہا ہے۔وہ اگلی بار ایک اور انجیو پلاسٹی کرنا چاہتے ہیں۔اور میرا اصرار ہے کہ اب مزید ایسا کچھ نہیں کریں۔اوپن سرجری کر گزریں جو ہونا ہے ہو جائے۔عنقریب اس بارے میں فیصلہ ہونا ہے۔

اسی دوران ہالینڈ سے لندن شفٹ ہو جانے والے دوست جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو اپنے بعض مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے اتنے جذباتی ہو گئے کہ خودکشی کی بات کرنے لگے۔میں نے انہیں سمجھایا کہ میں پاکستان میں ایک بار ایسی کیفیت سے گزرا ہوں لیکن اب تو

خدا کا فضل ہی فضل ہے۔ پھر ان پر جو خدا کے فضل اور احسانات ہیں ان کی طرف انہیں توجہ دلائی اور کہا کہ ہم بامراد لوگ ہیں، نامراد نہیں ہیں۔ سو خودکشی کا سوچنا بھی خدا کی ناشکری میں شمار ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک نازک مرحلہ پر میں ایک دوست کے لیے زندگی بخش اچھی باتیں کر سکا اور اس کے لیے وقتی طور پر سہی سکون کا موجب بنا۔

۱۲مئی کو مجھے ہالینڈ سے ایک دوست احسان سہگل کا ٹیلی فون آ گیا۔ کافی پریشان تھے اور بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ چیک اپ ہوا تو تمام رزلٹ اطمینان بخش تھے لیکن احسان سہگل پھر بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تو تسلی دینے والی باتیں کر دیں لیکن پھر گزشتہ برس اور اس برس کی اب تک کی اپنی صورتحال پر غور کیا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے نہ صرف مجھ جیسے کمزور اور بزدل انسان کو ہمت اور حوصلہ عطا کر رکھا ہے بلکہ پوری طرح سے خود سنبھال رکھا ہے۔ مبارکہ کی جسمانی حالت تو کانچ کی گڑیا جیسی ہو کر رہ گئی۔ اس کے باوجود روئے ما، گردوں کے مسئلہ اور دل کی بیماری کو یوں نبھا رہی ہے جیسے گھر کا معمول کا کام ہو۔ ڈائلسز سے آنے کے بعد انسان اچھا خاصا نڈھال ہو جاتا ہے۔ لیکن مبارکہ پانچ دس منٹ ریسٹ کرنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی ہے۔ البتہ کھانا کھانے کے بعد پھر گہری نیند سوتی ہے۔

۲۴مئی کو جرمنی میں سرکاری چھٹی تھی۔ اس دن بارش نہیں ہونا تھی۔ کئی دنوں سے چل رہی ٹھنڈ کے برعکس موسم خاصا بہتر تھا۔ چمکتی ہوئی لیکن نرم دھوپ میں ۲۵ ٹمپریچر نے فضا کو خوشگوار بنا دیا تھا (اس دن پاکستان کے بعض شہروں میں ٹمپریچر ۵۲ ہو گیا تھا)۔ ہم نے، پوری کی پوری فیملی نے اپنے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے مائن کے کنارے پکنک منانے کا طے کر لیا۔ اپنی اپنی سہولت کے مطابق پانچوں بچوں نے جو پکانا مناسب سمجھا پکا کر لے آئے اور سب دریا کے کنارے پر جمع ہو گئے۔ چھوٹے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے جو ہمارے گھر میں کھیلتے ہیں تو لگتا ہے کہ اودھم مچا رہے ہیں۔ اب یہاں کھل کر کھیل رہے تھے، اودھم مچا رہے تھے لیکن سب اچھا لگ رہا تھا۔ گزشتہ برس کی بیماریوں کی یلغار کے بعد مبارکہ پہلی بار دریا کے کنارے پہنچی تو یہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔ بیماریوں کے حملہ سے پہلے ہم دونوں میاں بیوی کئی بار چہل قدمی کرتے ہوئے دریا کے اس کنارے تک آئے ہیں اور کئی بار یہاں کے بنچوں پر دیر تک بیٹھے قدرتی مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ برس ۲۰۰۹ء میں ہم جس نوعیت کی سنگین بیماریوں سے گزرے ہیں، اس کے بعد سوچا نہیں تھا کہ مبارکہ اس طرح پھر سے ہنستے کھیلتے ہوئے

دریا کے کنارے تک پہنچے گی۔ لیکن خدا کے فضل سے ایسا ہو گیا تھا۔ ہمارے لیے یہ پکنک بھی خدا کی شکر گزاری کا جواز بن گئی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھی پکنک منائی جا سکتی تھی لیکن بچے اسی طرف رہنے پر مصر تھے کیونکہ یہاں کی گراؤنڈ وسیع تھی۔ کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے کے لیے کھلی جگہ تھی۔ دوسری طرف صرف بیٹھنے کے لیے دو تین بنچوں کا ہی انتظام تھا۔ چھٹی والے دنوں میں دریا کے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے ایک کشتی موجود ہوتی ہے۔ کرایا واجبی سا ہوتا ہے۔ میں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔ بچوں نے اس مختصر سے دریائی سفر کا لطف لیا لیکن دوسرے کنارے پر پہنچ کر واپسی کا شور مچا دیا۔ اصل میں وہ کشتی میں ہی سفر کرتے رہنا چاہتے تھے۔ مجھے ہرمن ہیسے کا ناول ''سدھارتھ'' بہت پسند ہے۔ دریا کی آوازیں سننا اور ان کا گیان حاصل کرنا بڑی بات تھی لیکن ہرمن ہیسے کے سدھارتھ نے میرے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کی معصوم اور زندگی سے بھرپور آوازوں کے ساتھ دریا کی آواز کو سنا ہوتا تو اسے ایک اور طرح کا گیان بھی نصیب ہو جاتا۔ میں اپنے بچوں کے بچوں میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سمیت اپنی ساری کائنات کا عکس دیکھ رہا ہوں اور وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کا اختتامی حصہ جیسے میرے اس تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔

''معاً / مَیں نے دیکھا / زمیں پر ہَوا تھی /
ہَوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے /
مگر سبز دھرتی کی / ٹھنڈی تہوں میں / جڑوں کی پُراسرار وحدت تھی /
سب فاصلے / ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے /
ہزاروں جڑیں / ایک ہی جڑ سے پھُوٹی تھیں /
آگے بڑھی تھیں / مگر جڑ سے ایسی جُڑی تھیں / کہ چلنے کے عالم میں / ٹھہری ہوئی تھیں /
یہ ساری جڑیں / سبز دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں /
جو خود اُس کے گیلے بدن میں / اُترتی گئی تھیں /
کہو کون تھا وُہ؟ / کہ جس نے کہا تھا: / ستارے فقط پات ہیں /
کہکشائیں / گندھی نرم شاخیں ہیں /
آکاش / اِک سبز چھتنار / ہر شے پہ سایہ کُناں ہے /
مگر اس کی جڑ / اس کے اپنے بدن میں / نہیں ہے! /

کہوکون تھا وہ/کہ جس نے ہَوا کی حسیں سرسراہٹ/لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا/
مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز/اور خواہشوں کے تلاطم کو/دکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟/
وہ جس نے/خود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو/اپنی جڑوں کو/فریبی، سیہ کار، جھوٹا کہا تھا؟
مرا اُس سے/کوئی تعارف نہیں ہے/
مجھے تو فقط/اپنے ''ہونے'' کا عرفان ہے/
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں/پَروں کو ہلاتی/حسیں قوس بن کر/مری سمت آتی ہوئی/فاختہ/
پھڑ پھڑاتے ستارے/گھنی گھاس کی نوک پر آسماں/سے اُترتی نمی/
اور پُورب کے ماتھے پہ/قشقے کا مدھم نشاں/
تیرگی کی گُپھا سے نکلتا ہُوا/روشنی کا جہاں/دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے/
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن/بھیگی پلکوں پہ دکھ کی تپکتی چُبھن/
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آبجُو/
اِک انوکھے پُراسرار معنیٰ کے/رگھاؤ سے رِستا لہو/مُسکراتے ہوئے لب/
یہ سب/میرے اوتار ہیں/
میری آنکھیں ہیں/مُجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں/
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!''

زندگی کا اسرار روح سے منسلک ہے اور روح کا بھید روحِ اعظم تک لے جاتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس بھید کو سمجھنے کی جستجو میں ہوں۔ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا تو ممکن نہیں لیکن پھر بھی غور وفکر کے نتیجہ میں جتنا کچھ منکشف ہوتا ہے میرے لیے روحانی لذت کا موجب بنتا ہے۔ میں اپنی یادوں کے باب ''روح اور جسم'' میں لکھ چکا ہوں کہ روح اور جسم لازم وملزوم ہیں۔کلوننگ کے سائنسی تجربہ کی کامیابی کے بعد یہ مذہبی تصور مزید مستحکم ہوا ہے۔تاہم مجھے جسم اور روح کے اس تعلق کے ساتھ روح کے جسم سے سوا ہونے کا ہلکا سا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں اس احساس کو شاید ڈھنگ سے بیان نہ کر پاؤں۔تاہم اس کے لیے ایک دو مثالیں کسی حد تک تفہیم میں مدد ہوسکتی ہیں۔خواب میں جسم اپنے بستر پڑا ہوتا ہے اور روح ایک اور جسم کے ساتھ کہاں سے کہاں تک پہنچی ہوتی ہے۔خواب میں ہم جن کیفیات سے گزر رہے ہوتے ہیں بیداری پر ان کے اثرات بھی ہم پر کسی نہ کسی حد تک طاری ہوتے ہیں۔مثلاً اگر ہم خواب میں دوڑ رہے

تھے تو بیداری پر سانس پھولی ہوئی ہوتی ہے۔اگر کوئی ڈراؤنا یا بہت سہانا خواب تھا تو بیداری پر اس کے ڈراؤنے یا سہانے اثرات بھی ہم پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ایک اور مثال بھی معین طور پر تو تفہیم نہیں کرتی لیکن اس سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔خوشبو پھول کے اندر موجود ہوتی ہے لیکن پھر وہ پھول سے الگ ہو جاتی ہے اور پھول مرجھا جاتا ہے۔کسی بزرگ کی تحریر میں پڑھا تھا کہ قیامت کے دن ہمیں نئے جسم دیئے جائیں گے۔ میں پرانے جسم کی اہمیت سے ابھی تک منکر نہیں ہو پا رہا۔ یوں تو ہمارے جسم کی کھال چند معیّن برسوں کے اندر غیر محسوس طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔صاحبِ جسم کو بھی اس تبدیلی کا ادراک نہیں رہتا۔ہم خود کو وہی کا وہی سمجھتے ہیں۔سو قیامت کے دن اگر ہمیں اسی انداز میں کوئی نیا جسم عطا کیا جاتا ہے جس سے ہم سب اپنا آپ اسی طرح اپنا محسوس کریں تو پھر اس سے ان بزرگ کی بات بھی بجا رہتی ہے اور نئے، پرانے جسم کا مسئلہ بھی کسی حد تک قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔

پاکستان اور انڈیا کے کئی چینلز جرمنی میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ایسے ہی چینلز میں ایک کا نام NDTV Imagine ہے۔گزشتہ برس اس چینل پر ایک رئیلیٹی شو''راز پچھلے جنم کا'' کے نام سے دکھایا گیا۔ چند محدود قسطوں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ میرے گھر والے اس شو میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ شاید انہیں یہ اپنے معتقدات کے خلاف لگتا تھا۔ میرے پیشِ نظر دو باتیں تھیں۔ایک تو یہ کہ میں ایک طویل عرصے سے کبھی ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی پچھلے جنم میں بادشاہ/راجہ یا سردار قسم کی چیز تھا اور کبھی ایسے لگتا ہے کہ میں کوئی سادھو، سنت، فقیر یا ملنگ تھا۔ میں اس بات کو اپنی بیوی کے علاوہ بعض بچوں کے ساتھ بھی بیان کر چکا ہوں۔ یہ دو مختلف دھاروں کا احساس پاکستان میں قیام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔اس لیے پچھلے جنم کا اسرار میرے لیے ذاتی دلچسپی کا موجب تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے روح کے بھید کو سمجھنے کی خواہش ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہ گیان اور معرفت مجھے کہیں سے بھی ملنے کی امید ہو میں ممکنہ حد تک وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ شو تو گھر بیٹھے ہی دستیاب ہو رہا تھا۔ اس میں ایک ماہرِ نفسیات خاتون ایک خصوصی نوعیت کے بیڈ کے ساتھ براجمان ہوتی تھیں۔ وہاں اپنے پچھلے جنم کی یاترا پر جانے کے خواہشمند کو لٹا کر پچھلے جنم کا کچھ حصہ دکھایا جاتا تھا۔ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ مسمریزم سے ملتے جلتے کسی نفسیاتی طریقے سے مریض کو ٹرانس میں لا کر پھر کسی جینیٹک وے سے یا صدیوں سے محفوظ لاشعور کے ذریعے ہمارے آباؤ اجداد کے کسی کردار کی فلم کے ذریعے سے نفسیاتی علاج کر دیا جاتا ہے۔

اس شو میں آنے والے بعض لوگ اپنے پچھلے جنم کی کئی انوکھی داستانیں سنا رہے تھے۔ میں ان

سب کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ تو سائنس کی ایک سادہ سی، درسی نوعیت کی عام سی بات ہے کہ ہر انسانی سیل کے نیوکلس میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔۲۳ ماں کی طرف سے اور ۲۳ باپ کی طرف سے۔کروموزوم کے اندر ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے DNA کہتے ہیں۔اس DNA کے مالیکیول کے مخصوص حصوں کو جین کہتے ہیں۔سیل کے ہر فعل کو کنٹرول کرنے والی ایک مخصوص جین ہوتی ہے۔انسانی جسم کے اربوں سیل میں سے ہر ایک سیل کے ۴۶ کروموزوموں کو ملا کر کروڑوں کی تعداد میں جینز ہوتی ہیں۔ایک سیل جس کے اندر یہ کروڑوں کی سرگرمیاں جاری وساری ہیں،اس کی مادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ سوئی کی نوک پر ۲۰ ہزار سیل سما جاتے ہیں۔(یہاں مجھے ایک غیر متعلق بات یاد آگئی۔بغداد پر ہلاکو خان کے حملہ کے وقت علماء کے دوگروہوں میں اس مسئلہ پر مناظرہ ہورہا تھا کہ ستر ہزار فرشتے سوئی کے ناکے میں سے گزر سکتے ہیں یا نہیں؟۔سوئی کی نوک پر مادی صورت کے حامل ۲۰ ہزار سیل سما سکتے ہیں جبکہ ہر سیل کے اندر کروڑوں جینز موجود ہیں،تو ناکے میں سے ستر ہزار فرشتوں کا گزرنا تو معمولی سی بات لگتا ہے)۔

سیل کی کارکردگی کی اس تفصیل کے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمارے اندر ہمارے آباؤ اجداد کی عادات وافعال کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے۔ان کے ذریعے ہمارے ننھیال، ددھیال کے اعمال وعادات کا بہت سارا حصہ ہم میں منتقل ہوجاتا ہے۔اپنے آپ کو کبھی کوئی مہاراجہ یا سردار اور کبھی کوئی ملنگ فقیر محسوس کرنا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے ددھیال، ننھیال میں سے کوئی ایسے رہے ہوں گے اور انہیں کی وہ بادشاہی اور فقیری میرے اندر بھی سرایت کرکے کسی نہ کسی رنگ میں میرے مزاج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

این ڈی ٹی وی پر پچھلے جنم کا جو سفر میں دیکھ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ اصل میں ان کے کروموزوم میں محفوظ آباؤاجداد کے کسی کردار کی زندگی کی کوئی پرچھائیں جیسی جھلک تھی۔یہ میں ان افراد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جن کی داستانوں میں کہیں کوئی ربط تھا۔لیکن کئی باتیں بے ربط یا بے جوڑ بھی محسوس ہوئیں۔مثلاً کسی کو شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے تو اس کے پچھلے جنم میں اسے کسی صندوق میں بند کرکے ڈبو دیا گیا تھا۔پچھلے جنم میں ظلم ہوا تھا تو اب تو اس کے بدلہ میں من میں شانتی اور کھلے پن کا احساس ہونا چاہیے تھا۔اگر وہی گھٹن کا احساس ابھی تک موجود ہے تو پھر نیا جنم پچھلے جنم کا اجر نہیں بنتا بلکہ اسی سزا کا تسلسل لگتا ہے جس کے نتیجہ میں پچھلا جنم انجام کو پہنچا۔تاہم میرا مقصد یہاں ہرگز ہرگز کسی کے عقائد پر اعتراض کرنا نہیں ہے بس اس پروگرام کو دیکھتے وقت روح کی کھوج کی میری لگن جو کچھ سجھاتی رہی وہ بیان

کررہا ہوں۔بعض پروگراموں میں جو کچھ دکھایا گیا انہیں کے اندر پچھلے جنم کی داستان کی تردید ہوگئی۔مثلاً ایک لڑکی کے پچھلے جنم میں اس کی ساس نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔وہ اپنے پچھلے جنم کے گھر کے علاقہ اور ہاؤس نمبر سے لے کر اسکول کے نام پتہ تک کی ساری تفصیل بیان کرتی ہے۔لڑکی کا پچھلا جنم بھی دہلی میں ہوا اور موجودہ جنم بھی دہلی میں ہوا۔لیکن جب پچھلے جنم کے مقامات کی تصدیق کرنے گئے تو کوئی بھی درست ثابت نہ ہوا۔اسی طرح انڈیا میں پنجابی فلموں کی ایک اداکارہ پچھلے جنم میں یاسمین خان تھی،سلطان نامی مسلمان سے محبت کرتی تھی۔رنجیت سنگھ کے مزار پر جھاڑو دیا کرتی تھی۔۱۹۴۷ء میں اسے مسلمانوں نے قتل کردیا۔کسی مسلمان کو کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں قتل ہوتا بتایا جاتا تو قابلِ فہم بات ہوتی یا پھر لڑکی ہندو یا سکھ ہوتی اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں ماری جاتی تو پچھلے جنم کا راز سمجھ میں بھی آتا۔اس طرح کے کئی بے جوڑ نتائج پر مبنی پروگرام ماہرِ نفسیات خاتون کی تشخیص کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہندو عقائد کے حوالے سے روح کے اسرار کی باتیں ہورہی ہیں تو مجھے ان میں ایک بڑا انوکھا اور دلچسپ تصور بھی ملا ہے۔ہستیٔ باری تعالیٰ جو اس کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ بھی ہے اور روحِ اعظم بھی،اصلاً ہم اس عظیم ترین ہستی کو بھی اپنے معاشرتی رویوں کے حوالے سے دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔جبکہ وہ ہمارے سارے تصورات اور قیاسات سے بالا ہے۔چونکہ ہمارا معاشرہ مردانہ بالادستی کا معاشرہ ہے اسی لیے خدا کے بارے میں بھی عام طور پر مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ہمارے برعکس قدیم ہندوستان کے مادری نظام کے اثرات کے نتیجہ میں ہندوؤں میں دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا تصور بھی موجود رہا ہے۔شری دیوی بھگوت پُران میں خالقِ کائنات عورت کے روپ میں ہے۔اس عقیدہ کے مطابق خالقِ کائنات شری دیوی اپنی تنہائی اور شدتِ جذبات سے مضطرب ہوئی تو اس نے اپنی ہتھیلیوں کو رگڑا۔اس کے نتیجہ میں ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے،جو پھوٹ بہے تو پانی کا ایک سیلاب آگیا۔اس پانی سے برہما کی پیدائش ہوئی۔شری دیوی نے برہما سے جنسی ملن کی خواہش کا اظہار کیا مگر برہما نے اسے اپنی پیدا کرنے والی کہہ کر اس عمل سے انکار کردیا۔تب شری دیوی نے برہما کو فنا کردیا۔ان کے بعد وشنو کو پیدا کیا گیا اور ان سے بھی وہی خواہش دہرائی گئی،وشنو نے بھی برہما کی طرح انکار کیا اور ان کو بھی برہما جیسے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔وشنو کے بعد شنکر کا جنم ہوا۔شنکر اِن معاملات میں کافی معاملہ فہم نکلے۔انہوں نے دو شرطوں کے ساتھ شری دیوی کی بات ماننے پر رضامندی ظاہر کردی۔ایک شرط یہ کہ برہما اور وشنو کو دوبارہ پیدا کریں اور ان کے لیے دو دیویاں بھی پیدا کی جائیں۔دوسری شرط یہ کہ شری دیوی خود دوسرا روپ

اختیار کریں کیونکہ اس روپ میں بہر حال وہ ماں کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ شری دیوی نے برہما اور وشنو کو ان کے جوڑوں کے ساتھ دوبارہ خلق کیا اور خود بھی پاروتی کا دوسرا روپ اختیار کیا۔شنکر اور پاروتی کی داستان ہندوؤں کے عقائد میں آج بھی کئی جہات سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے پدری بالا دستی والے معاشروں میں خدا مردانہ صفات کا حامل دکھائی دیتا ہے تو مادری نظام کے قدیم ہندوستان میں خدا کے عورت جیسے روپ کی بات دلچسپ ہونے کے ساتھ اپنے ثقافتی پس منظر میں قابلِ فہم بھی لگتی ہے۔ باقی خالقِ حقیقی تو ہمارے ہر مردانہ وزنانہ تصور سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ صفات بھی اس کو سمجھنے اور اس تک رسائی کا ایک وسیلہ تو ہیں لیکن اس عظیم تر حقیقت کے سامنے صفات بھی بہت نیچے رہ جاتی ہیں۔ صفات کا معاملہ یوں ہے کہ ذاتِ احد ہونے کے باوجود ہم صفات کے وسیلے سے اسے مخاطب کرتے ہیں۔مثلاً: ''اے میرے رحیم خدا! مجھ پر رحم فرما'' کہیں گے۔رحیم خدا کی بجائے قہار خدا کہہ کر رحم نہیں مانگیں گے۔اسی طرح رزق مانگتے وقت رزاق خدا کہیں گے، جبار خدا نہیں کہیں گے۔علیٰ ھذ القیاس۔اب میرے سوچنے کا معاملہ یوں ہو جاتا ہے کہ بُت سامنے رکھا ہو یا ذہن میں بنایا ہوا ہو، اسے بُت ہی کہیں گے۔کہیں صفاتِ باری تعالیٰ کے معاملہ میں ہم بھی ذہن میں چھپائی ہوئی بت پرستی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے؟

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الااللہ

(یہاں مجھے لاہور میں منعقدہ جماعت اسلامی کے ایک خاص یومِ تاسیس کی یاد آگئی۔ بڑے پیمانے کی اس تقریب میں علامہ اقبال کی نظم ''خودی کا سِرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ'' خوش الحانی سے پڑھی گئی۔نظم کے تمام اشعار پڑھے گئے لیکن مذکورہ بالا شعر سنسر کر دیا گیا۔اس سنسر شپ کی خبر اخبارات میں چھپی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہاں چور کی داڑھی میں تنکا والی کوئی بات رہی ہوگی، لیکن میں نے اس سنسر شپ کی خبر کا بھر پور لطف لیا تھا)

میرا خیال ہے اپنے آپ کو سمجھنے میں اور خالقِ کائنات کو سمجھنے میں شاید میں کچھ بھٹکنے سا لگا ہوں اس لیے جوگندر پال کے ایک افسانہ ''سانس سمندر'' کے خوبصورت اقتباس کو خود پر منطبق کرتے ہوئے، اپنی اس روداد کو سمیٹتا ہوں۔مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔

''وہ پکی قبر؟......وہ ایک مجذوب کے قبضے میں ہے۔ بے چارہ اپنی اس کھوج میں دنیا سے باہر نکل

گیا کہ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا۔ارے بھائی تم ہو ہی کیا، جو کچھ ہوتے؟ وہ تو شکر کرو کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو چوم چاٹ کر تمہیں بنا دیا۔مگر باؤلا اپنی چھوٹی سی سمجھ بوجھ کو نہ چھوڑے ہوتا تو اتنی بڑی دنیا کیوں چھوڑتا۔تل گیا کہ اپنی تلاش میں وہیں جانا ہے جہاں سے آیا ہوں۔عین وہیں پہنچا ہوا ہے اور اپنی قبر کی پکی دیواروں کے اندر ہی اندر کچی مٹی ہو چکا ہے۔

ذرے کو جان کیا ملی کہ پاگل نے مٹی سے کھیلنے سے انکار کر دیا مگر مٹی تو اپنے ذرے ذرے سے کھیلتی ہے۔''

یہاں تک آتے آتے مجھے ایسا لگا ہے جیسے آج میرے اندر کے بادشاہ اور ملنگ میں لڑائی ہوگئی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ جیت گیا ہے اور فقیر کو قبر میں ڈال دیا گیا ہے۔لیکن فقیر کی تو قبر بھی زندہ رہتی ہے اور سانس لیتی ہے۔اب میں نہ خود سے مزید مکالمہ کر سکتا ہوں نہ اپنے قارئین سے مزید گفتگو کی گنجائش ہے، بس خدا سے ایک سوال ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی کہانی کا درویش بھی میں ہوں، سلطان بھی میں ہوں،
اور خدا کا سادہ دل بندہ بھی میں ہی ہوں۔

عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد۔ شمارہ: اگست ۲۰۱۰ء
جدید ادب جرمنی۔شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۱۱ء

''بیماری یا روحانی تجربہ'' کی ای بک اکتوبر 2020ء میں

ریلیز کیے جانے کے بعد

اہم ادباء اور قارئین کی طرف سے موصولہ چند تاثرات

ڈاکٹر عامر سہیل (ایبٹ آباد)

بیماری یا روحانی تجربہ

مجھے جناب حیدر قریشی کے فکر و فن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو ان سے براہِ راست کچھ ملاقاتیں ہیں جو ان کے قیام ایبٹ آباد کے دوران ہوئیں اور ان کی ادبی شخصیت اور ادبی مصروفیات کا اندازہ ہوا، پھر ''اوراق'' کے حوالے سے مجھے جہاں اور ادیبوں کی تحریروں کو تسلسل سے پڑھنے کا موقعہ ملا وہاں قریشی صاحب کے انشائیے، تنقیدی مضامین، شاعری اور افسانے دل لگا کر پڑھے۔ پھر ماہیا نگاری کے حوالے سے قریشی صاحب کے معرکے اردو ادب میں ایک بڑی تحریک بن کر سامنے آئے جن سے میری خاص دلچسپی تھی۔ آخری بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے ان کی ادبی خدمات پر باضابطہ تحقیق کا موقعہ بھی ملا جس کی وجہ سے قریشی صاحب کا وژن مجھ پر منکشف ہوا۔ مجھے ان کی تحریریں پڑھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ روحانی، کشفی اور وجدانی معاملات کو اپنی زندگی کا قیمتی اور لائقِ توجہ جزو سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے علاوہ خاکہ نگاری اور کھٹی میٹھی یادوں میں بھی اس موضوع پر کافی سرمایہ موجود ہے۔ اس موجودہ کتاب (بیماری یا روحانی تجربہ) کو اگر ان کی تمام تخلیقی سرگرمیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی شخصیت اور ادبی بصیرت کا جامع منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔ روحانی تجربہ اپنی نوعیت میں یکسر انفرادی اور موضوعی ہے اس لیے ہر شخص کے تجربات دوسروں سے مختلف اور معنی خیز ہیں۔ میں تو روحانی تجربات کو روح کا فرنیچر کہتا ہوں جو انسان کی زندگی میں سہولت اور خوبصورتی کا باعث بنتا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قریشی صاحب کی زندگی میں جو بار بار انوکھے اور اچھوتے واقعات پیش آتے ہیں اس کی وجہ سے ان کی زندگی کا سکھ چین بڑھا ہے اور ہمیشہ اس سے بڑا فائدہ ہی پہنچا ہے۔ یہ اطمینان قلب اور اسباب

میں اضافہ کوئی معمولی شئے ہرگز نہیں۔ بیماری کے دوران ہونے والے روحانی تجربات نے قریشی صاحب کی ساتویں حس بیدار کر دی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو کائناتِ اصغر اسی لیے کہا گیا کہ یہ بھی ایک طلسماتی جہان ہے جسے دریافت کرنا خاصا مشکل ہے۔قریشی صاحب باہمت انسان ہیں کہ ایسے واقعات کو کامل یکسوئی اور ادبی ذمہ داری سے پیش کر دیتے ہیں۔اس کتاب کا مطالعہ بار بار کرنا چاہوں گا کیونکہ کچھ مقامات میرے اپنے ذہن میں ابھی بہت واضح نہیں ہیں ممکن ہے دوسری یا تیسری قرات میں مزید گتھیاں سلجھ جائیں۔قریشی صاحب کو اتنی شانداراور فکری امکانات سے بھر پوراور ثروت مند کتاب لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

قانتہ قدیر(لندن): بہت ہی مزہ آیا۔ساری بک پڑھ لی ہے۔ایک دفعہ شروع کی، پتہ ہی نہیں چلا اورختم ہوگئی۔ بہت ہی روحانی حالت تھی۔

ڈاکٹر رضیہ حامد(بھوپال): بھائی آپ کی نئی کتاب ملتے ہی ایک ہی نشست میں پڑھ لی۔ ماشاء اللہ آپ صاحبِ کشف ہیں،سبحان اللہ۔ بہت بہت مبارک باد۔اللہ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔آمین۔

ڈاکٹر ریاض اکبر(آسٹریلیا): کمال کی تخلیق ہے ذہن بھی۔اتنا سا ایک پیڑا اوراس میں راستہ بنا کر گزرتے ہوئے برقی رَو کے ہزار ہا سگنل اوران سگنل کے ذخیرے۔

جوگی بن کر چھم چھم ناچوں صاحب کا دیوانہ میں
میں دھرتی تو صاحب سورج، شمع وہ، پروانہ میں

ماشاءاللہ۔علاج جاری رکھیں۔راس آ رہا ہےاور روحانی تجربات اس کے علاوہ ہیں۔

ڈاکٹرمحمد عبدالخالق(قاہرہ،مصر): بہت بہت مبارک ہوسر۔۔۔بھیجنے کا بہت شکریہ

فرحت نواز کے کمنٹس اور استفسار

فرحت نواز (رحیم یارخان): کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔بہت دلچسپ لگی ہے اور بہت منفرد بھی۔ پڑھنے والے ان تجربوں کو جھٹلا نہیں سکیں گے۔ یہ توجہ کھینچنے والی کتاب ہے، مجھے تو بہت اچھی لگی۔

فرحت نواز: آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد سے اس کے مندرجات مسلسل ذہن میں گھوم رہے ہیں

۱۔نومینز لینڈ کو عالمِ ارواح کہہ سکتے ہیں؟
۲۔پڑھنے والے آپ کی باتوں کو کس بنیاد پر جھٹلائیں گے؟
۳۔کیا یہ تجربے ایمان کی پختگی پر منحصر ہیں؟
۴۔ان روحانی تجربوں کے لئے اللہ سے مضبوط روحانی تعلق ضروری ہے؟

اس طرح کے سوال ذہن میں آتے رہتے ہیں۔

جواب از ح۔ق:

۱۔جی بالکل عالمِ ارواح کا پہلا پڑاؤ۔۔۔۔یہاں سے بہت سارے لوگوں کو واپس بھیجا جاتا رہتا ہے۔
۲۔کوئی جھٹلائے بھی تو فرق نہیں پڑتا۔میں نے وہ بیان کیا ہے جو مجھ پر گزرتا رہا۔کوئی فرقہ نہیں بنایا
۳۔خدا پر ایمان کی پختگی تو لازمی ہے،البتہ کسی خاص فرقے یا مذہب سے ہونا لازمی نہیں۔
۴۔روحانی تعلق کیا ہے؟ روحانیت کیا ہے؟۔۔انسانی روح کا روحِ اعظم (اللہ تعالیٰ) کی جستجو کا سفر۔۔۔جس کی جتنی جستجو ہوگی اس کے مطابق اللہ میاں اس پر منکشف ہوتا جاتا ہے۔منکشف ہونا ہی روحانی تجربہ ہے۔اللہ تعالیٰ جیسا چاہے ویسا تجربہ کرا دے۔

کولمبس خاں(Noderstadt جرمنی): آپ کی ارسال کردہ کتاب ''بیماری یا روحانی تجربہ'' کا بہت بہت شکریہ۔خاکسار گزشتہ دنوں بیرونی ذمہ داریوں میں کافی مصروف رہا۔مختصراً عرض ہے کہ آپ کی کتاب کے مطالعے سے اپنے اور بعض دوسرے احباب کے اس سے قدرے ملتے جلتے تجربات پر گفتگو تو ہوتی رہی ہے لیکن جس مدلل انداز سے آپ نے س کے سائینسی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر شعوری کیفیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے حواس خمسہ کو کسی چھٹی یا ساتویں حس کے حوالے کر کے ریکارڈ کیا ہے یہ پہلی بار میرے علم میں آیا ہے۔اگرچہ اس سے پیشتر میں نے Near death experience کا کسی قدر مطالعہ تو کیا ہے لیکن میرے لئے آپ کی گواہی میں جو ثقاہت ہے وہ ایک یقینی علم کا باعث ہے۔

یہ موضوع نہایت دلچسپ ہے۔اس پر ڈسکشن کی بھی ضرورت ہے۔اور ان کیفیات کو تصور میں خود پروارد کر کے کسی حد تک مزید سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ کام کرنے والی زندگی سے نوازے۔

وقاص سعید(آسٹریلیا): ماشاءاللہ، سر بہت بہت مبارک ہو۔

سرت دی سوئی، پریم دے دھاگے، پیوند لگے ست سنگے
کہے حسین فقیر سائیں دا تخت نہ ملدے منگے

زارا حیدر(بدین): بہت اچھا لگا پڑھ کے۔سر نے جو شو کی بات کی ہے، کبھی کبھی زندگی کے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے یہ سب پہلے ہو چکا ہے۔شاید وہ انسان کے لاشعور میں پہلے سے نقش ہوتا ہے اور اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً نظر آتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر راحیلہ خورشید(مظفر آباد): سر زبردست۔۔آپ سے کام کرنے کی تحریک ملتی ہے۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

حیدر قریشی کا کتابچہ ''بیماری یا روحانی تجربہ''

حیدر قریشی نے اپنے کتابچے''بیماری یا روحانی تجربہ'' کا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے کہ اس کے مشمولات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ساتھ ہی قاری کو اس کے مطالعے میں شریک کرتے ہوئے اس کے ذہن کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ اس سے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق مفاہیم کا استخراج کرے۔وہ کمال سادگی سے اپنے پہلے فقرے ہی میں اہم نکات سمیٹنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔مذکورہ نکات میں درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔انہیں کچھ پیش آیا۔

۲۔انہوں نے کوئی روحانی تجربہ کیا ہے۔

۳۔انہوں نے دونوں کو جہاں تک بیان کرنا ممکن تھا بیان کر دیا ہے۔

اپنے دوسرے فقرے میں وہ جو کچھ پیش آیا اور جو روحانی تجربہ انہوں نے کیا ہے، اس کو عام سا کشف نہیں بلکہ ایک نادر کشف خیال کرتے ہیں۔یہ کشف انہیں اس خیال سے نادر معلوم ہوتا ہے کہ اس کشف میں ان کو ان کا جسم بھی شریک محسوس ہوتا ہے۔اپنے اس تجربے، پیش آنے والے واقعے کو کشف، نادر کشف کا درجہ دینے کے بعد حیدر قریشی اس کو اپنے دادا جی اور ابا جی کے تجربات سے جوڑتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا تجربہ ایک روحانی تجربہ تھا اور انہوں نے اپنے تجربے میں اپنے پڑھنے والوں کو شریک کیا ہے۔

حیدر قریشی نے قاری کو اختیار دیا ہے کہ وہ اس واقعے یا تجربے کو روحانی تجربہ قرار دے یا بیماریوں کا اثر یا دواؤں کا ری ایکشن سمجھے۔حیدر قریشی نے اس سے آگے اپنی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' سے ایک اقتباس شامل کیا ہے، اس کا لبِ لباب یہ مندرجہ ذیل فقرہ ہے۔

''میرا شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ سائنس خدا کی نفی کرتے ہوئے اسی کی طرف جا رہی ہے، مذہب روحانی طور پر اسی کی طرف سفر کراتا ہے اور ادب بھی جمالیاتی سطح پر اسی حقیقتِ عظمیٰ کی طرف سفر کرتا ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس شامل کر کے حیدر قریشی نے اپنے زیرِ تذکرہ واقعے یا روحانی تجربے کو اپنی فکری زندگی کے ماضی سے ہم رشتہ کر دیا ہے اور خوب کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس سے آگے اپنے خاکوں ''برگد کا پیڑ'' اور ''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' سے موزوں اقتباسات شامل کر کے اپنی کتاب کی تفہیم میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ خاکے 1986 اور 1990 کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ حیدر قریشی نے اصرار کے ساتھ یہ لکھا ہے۔

''میرا تجربہ خواب نہیں جیتے جاگتے، پورے ہوش وحواس کے ساتھ تھا۔۔۔میں ایک ہی وقت میں اپنے سارے بچوں کے ساتھ بھی بات کر رہا تھا اور دوسری دنیا میں بھی موجود تھا۔ بچے میری کیفیت کو میرا آخری وقت شمار کر رہے تھے۔ میں بھی پہلے یہی سمجھا تھا لیکن دوسری دنیا میں پھر جو کچھ ہوا وہ چار دنوں پر پھیلا ہوا ایک انوکھا روحانی تجربہ بن گیا۔''

حیدر قریشی نے فرحت نواز کے خواب کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور اس کو خواب ہی بتایا گیا ہے۔ اس خواب کے شمول سے قاری کو روحانی وقوعے، تجربے اور خواب کے تقابلی موازنے کی سہولت دستیاب ہوگئی ہے۔ اس خواب کے شامل کرنے سے کتاب میں اسرار سے معمور سہی لیکن قدرے خوش آئند عنصر آمیز ہو گیا ہے اور کتاب ادبِ عالیہ کے دو اہم بوطبقائی لوازمات ''انسٹرکشن'' اور ''انٹرٹین منٹ'' کی حامل ہوگئی ہے۔

کسی واقعے کا وقوع ہونا یا پیش آنا غیر اختیاری ہے، ہو جاتا ہے، لیا نہیں جاتا۔ حیدر قریشی نے ابلاغ کے معاملے میں ایک کارِ نمایاں سرانجام دیا ہے۔ یہ کوئی معمولی تحریر نہیں ہے۔ یہ ایک سے زائد قرأت کا مطالبہ کرتی ہے۔

آیئے ایک بار پھر پڑھیں!

شہناز خانم عابدی (کینڈا)

تاثرات

جناب حیدر قریشی صاحب　　السلام علیکم

آپ کی کتاب ''بیماری یا روحانی تجربہ'' پڑھی۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ پڑھنی شروع کریں تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں نے اسے دو مرتبہ میں مکمل کیا ہے۔

کوئی شخص جب بیمار ہوتا ہے تو اسے ایک تو بیماری کی تکلیف اور دوسری اس کے ساتھ کی پریشانیاں، جیسے تشخیص وغیرہ کے مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ آپ بہت باہمت آدمی ہیں کہ اتنے مشکل حالات میں بھی آپ نے قلم وقرطاس کا رشتہ نہیں چھوڑا۔

آپ نے اپنے تجربات، اپنے دادا جی اور اپنے والد صاحب کے تجربات کا بہت اچھے پیرائے میں تذکرہ کیا ہے۔ آپ کے جذبات، آپ کے الفاظ دل میں اتر جاتے ہیں۔ زندگی بھی کتنی عجیب چیز ہے، کیسے کیسے واقعات اور تجربات سامنے آتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو سچے دل سے لا الہ (الا اللہ) پر یقین رکھتا ہے اور وہ اللہ کو پانے کی چاہ بھی رکھتا ہے، جستجو بھی کرتا ہے، کوئی آپ کی منزل تک پہنچتا ہے، کوئی نہیں۔

میری طرف سے آپ کو ایک اچھی کتاب کے لئے بہت بہت مبارکباد!

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائیں۔

ف س اعجاز (کلکتہ): پیش کش بہت عمدہ ہے۔ عنوان کے بعد متن دیکھا تو نئی مقصدیت کا احساس ہوا۔ مبارک ہو۔

یعقوب نظامی (بریڈفورڈ، برطانیہ)

تاثرات

آج اتوار کو چھٹی کا دن تھا۔ میں صبح سے آپ کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب ''بیماری یا روحانی تجربہ'' تو کافی دنوں سے وٹس ایپ کے ذریعے مل گئی تھی، جس پر گروپ میں کچھ احباب نے رائے بھی دی لیکن میں پڑھے بغیر رائے کا اظہار کرنے کا قائل نہیں۔

آپ کی کتاب کو میں نے تفصیل کے ساتھ پڑھا اور اس موضوع پر غالباً پہلی کتاب پڑھی۔ اس سے ملتے جلتے واقعات میں نے سنے تو تھے لیکن انہیں افسانہ یا کہانی قرار دیا۔ ایک بار جیو ٹیلی ویژن پر غالباً سامعہ خان نامی ایک خاتون جو پامسٹری کی بھی ماہر ہیں، نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اب تک دو بار مر کر زندہ ہو چکی ہیں۔ ایک بار تین چار سال کی عمر میں، دوسری بار جوانی میں۔ اس نے بتایا تھا کہ میری روح نکل کر چھت کے ساتھ ملحق ہو گئی اور میں اپنی لاش کو بستر پر دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں اس جہاں سے ابھی نہ جانے کے لئے بضد تھی۔ پھر ساتھ لے جانے والوں نے کچھ مشورہ کیا اور مجھے واپس بھیج دیا۔

آپ کے خاندانی روحانی تجربات بہت ہی دلچسپ ہیں۔ دادا جان اللہ رکھا قریشی اور اللہ رکھا کمہار کا واقعہ حیرت انگیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ موت کا دن مقرر ہے، لیکن آپ کے دادا جان کو غسل دینے اور کفن پہنائے جانے کے باوجود اسی دنیا میں مزید زندگی گزارنے کا موقعہ ملا اور پھر آپ کے والدِ گرامی کا واقعہ جنھوں نے روشنی میں بزرگوں کو دیکھا، کرامات کو ظاہر کرتی ہے۔

قرآن پاک میں سورہ نور میں ارشادِ خداوندی ہے:

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔

انسانی روح بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے پھونکی ہوئی ہے۔ روح کی حقیقت سمجھنے کے لئے ہمارے پاس ابھی تک کوئی علم نہیں لیکن اس سے قریب تر اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ روشنی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ آپ کی بیماری اور روحانیت یقیناً ایک کڑی ہے اور آپ نے دیانتداری کے ساتھ اپنے تجربات کو بیان کیا ہے جسے لا دین بیک جنبش قلم مسترد کر دیں گے، سائنس دان اسے مختلف زاویے سے دیکھیں گے لیکن اہلِ ایمان اور قرآنی علم کے حامل لوگ اسے اللہ تعالیٰ کا کرشمہ اور ان تجربات کو درست قرار دیں گے۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ بہت سے دانشوروں کے برعکس آپ دین سے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ باعمل مسلمان نماز، روزہ اور حج کی سعادت کے ساتھ قرآن فہمی کے حامل ہیں۔

آپ کی بات درست ہے کہ ابھی انسانی دماغ کا دس پندرہ فیصد ہی استعمال ہوا ہے۔ جوں جوں یہ صلاحیتیں بڑھیں گی انسان کو اپنی ہستی کے بارے میں انکشافات معلوم ہوتے جائیں گے جو انسان کو دین سے دوری کی بجائے قریب لائیں گے۔

چند سالوں سے کیمرے کی آنکھ نے انسانی زندگی کو بڑے آسان طریقے سے محفوظ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور پھر کمپیوٹر نے ہمارے ریکارڈ کو بہتر طور پر محفوظ اور ایک بٹن دبانے سے مطلوبہ معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں، تو میں سوچتا ہوں کہ انسانی ایجاد کردہ کمپیوٹر اگر یہ کمالات دکھا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مین فریم سپر کمپیوٹر میں تو ہر چیز خود بخود محفوظ ہو رہی ہوگی جسے روزِ حشر ایک بٹن دبانے سے ہمارے سامنے لا کر پیش کر دیا جائے گا۔ اس طرح جوں جوں سائنس ترقی کر رہی ہے قرآنی تعلیمات مزید واضح ہوتی جا رہی ہیں۔

سورہ نور کی اس آیت پر بات ختم کرتا ہوں کہ۔۔۔

اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کرشمات کی جھلکیاں دکھا رہے ہیں۔

خالد یزدانی (لاہور) انھوں نے اپنی نئی کتاب ''بیماری یا روحانی تجربہ'' میں اپنی بیماری کی روداد کو جس سچائی سے بیان کیا وہ قابل تعریف ہے، جہاں تک حیدر قریشی کی نظم ونثر کا تعلق ہے تو پاکستان کے اس بہت اچھے قلم کار کی توصیف پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔انہوں نے کسی صلہ وستائش سے بے نیاز ہوکر صرف اور صرف دل سے لکھا ہے اور دل سے لکھا دوسروں کے دلوں پر بھی اثر کرتا ہے۔دعا ہے کہ حیدر قریشی کا قلم یونہی رواں دواں رہے اور ہم سب ان کی تحریروں سے مستفید ہوتے رہیں۔

مرزا حبیب الرحمٰن (خان پور) اس سارے معاملے میں آپ کے خاندانی پس منظر جو آپ کے خون میں شامل ہے اس کے بھی اثرات ہیں۔آپ کا نام،خاندان،اعلیٰ تخیل،طویل جدو جہد، بیماری پر صبر واستقامت اور شاید بے چین روح،ان سب کے باعث یہ سب میرے لئے حیران کن نہیں ہے۔۔۔۔اگر کوئی دوست میٹا فزکس آف حیدر قریشی پر آپ کی تحریروں کی روشنی میں کام کرے تو ایک اچھی کتاب مرتب ہو جائے گی۔باقی اس کتاب میں فرحت نواز کا ذکر خوشگوار محسوس ہوا جو شاید بعد میں تاریخی ادبی حوالے کے طور پر ذکر ہوگا۔۔۔۔مجھے اپنے شہر کے ساتھ محبت ہے۔باپ فیصل آباد کا مغل پنجابی اور ماں مقامی سرائیکی۔مجھے آپ سے عقیدت اس وجہ سے ہے کہ آپ اردو ادب کے آفتاب و ماہتاب بن کر بھی آپ کی تحریروں میں خان پور،سرائیکی ادب،رحیم یار خان نظر آتا ہے۔باقی آپ نے جتنا کام کرلیا ہے اب آپ تو اپنے کارہائے نمایاں سے بلھے شاہ کے اس مصرع کا مصداق ہیں۔بلھے شاہ اساں مرنا ناہی گور پیا کوئی ہور

نازیہ خلیل عباسی (میران شاہ) تین کونٹینٹ پڑھے ہیں۔روحانیت کیا ہے؟،ابا جی اور دادا جی کے تجربات اور پیش لفظ۔۔۔آپ پر جو اثرات ہوئے اور آپ جن تجربات سے گزرے وہ بھی کافی دلچسپ ہیں۔آپ کا اسلوب ہمیشہ کی طرح خاصا دلچسپ ہے۔خاص بات کو آسانی،روانی اور بے ساختگی سے کہہ دیتے ہیں،یہی وجہ ہے کہ پڑھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا۔

راحت نوید (امریکہ)

بیماری یا روحانی تجربہ

''بیماری یا روحانی تجربہ'' یہ نام ہے اس کتاب کا جسے حیدر بھائی نے ''کتابِ دل'' بھی کہا ہے۔ایک بڑے رائیٹر کے بارے میں لکھنا ایک مشکل کام ہے جبکہ ان کے حلقۂ احباب میں بھی بہت اعلیٰ ذوق اور پائے کے ادیب اور شاعر لوگ موجود ہوں اور لکھ رہے ہوں۔

یہ کتاب واقعی پیش آنے والے ایک روحانی تجربے کے بیان پر مشتمل ہے۔ابا جی اور دادا جی کے واقعات تو میں نے بھی فیملی کے افراد سے سن رکھے تھے اور حیدر بھائی کی کتابوں میں پڑھ رکھے تھے۔اب ان کا یہ تجربہ مجھے بھی نسل در نسل روحانیت کی منتقلی کی کڑی دکھائی دیتا ہے۔

آج کے دور کے بچے جو سائنس فکشن موویز وغیرہ دیکھتے رہتے ہیں وہ تو شاید اس بات کو بھی کوئی فلم یا ویڈیو گیم سے منسوب کریں لیکن ہم لوگ جنھوں نے اپنے بزرگوں کے واقعات سنے ہوئے ہیں کہ کئی دفعہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ اپنے کئی بندوں کی مدد فرمائی۔اور بزرگوں پر کشفی کیفیات بھی طاری ہوئیں،تو ان سب کی روشنی میں میری عقل یہ کہتی ہے کہ یہ یقیناً روحانی تجربہ ہی تھا۔اور پھر نوید کے ساتھ تین گھنٹے سے زائد مسلسل بات کرنا،میں خود اس کی چشم دید گواہ ہوں۔ایک شخص جو انتہائی سخت بیماری سے پوری طرح اُٹھا بھی نہیں کہاں سے اتنی ہمت لے آیا کہ بلا تکان باتیں ہی کرتا چلا رہا تھا۔

حیدر بھائی کے ہی ایک شعر پر بات ختم کرتی ہوں۔

دنیا کو سمجھائیں کیسے، آخر کیسے سمجھے
باتیں اپنی سچی،سیدھی اور دنیا ہے گول

وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الخَیرُ ط

(آل عمران:۲۷)

حیدر قریشی سے متعلق اب تک ہونے والا یونیورسٹی سطح کا تحقیقی کام

۱۔حیدر قریشی شخصیت اور فن ۔۔۔۔منزہ یاسمین (**ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء**)

(اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان)

۲۔حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں ۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالرب استاد (تحقیقی مقالہ برائے **پی ایچ ڈی ۲۰۱۳ء**)

(گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)

۳۔حیدر قریشی۔حیات و خدمات انجم آراء (**ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء**)

(کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا)

۴۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات ۔۔۔۔عامر سہیل (تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، ۲۰۱۴ء)

(ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان)

۵۔حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ (**ایم فل کا مقالہ**، سال ۲۰۱۴ء)

(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۶۔حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان (**ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۴ء**)

(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۷۔حیدر قریشی کی شاعری کی روشنی میں بیرونی ممالک کی اردو شاعری۔''تنقیدی مطالعہ اور ترجمہ''

شعر المہجر عند حیدر قریشی ''دراسة تحلیلیة نقدیة مع الترجمة''

احمد عبد ربہ عباس عبدالمنعم (**ایم اے کا مقالہ سال ۲۰۱۵ء**)۔**ازہر یونیورسٹی۔قاہرہ، مصر**

یہ مقالہ عربی میں لکھا گیا ہے اور اس کے لیے حیدر قریشی کے چار شعری مجموعوں کا عربی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

۸۔مجلّہ ''جدید ادب'' کی ادبی خدمات'' از کنول تبسم (**ایم فل کا مقالہ۔سال ۲۰۱۸ء**)

وفاقی اردو یونیورسٹی۔اسلام آباد

۹۔رسالہ ''جدید ادب'' کی ادبی خدمات۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ از محمد شعیب

ہزارہ یونیورسٹی۔مانسہرہ۔ (ایم فل کا مقالہ۔۲۰۱۸ء)

۱۰۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث۔۔۔۔شازیہ حمیرہ ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

سال **۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء**۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور،

۱۱۔حیدر قریشی بہ حیثیت محقق و نقاد۔۔۔۔صغریٰ بیگم **ایم فل کا تحقیقی مقالہ**

سال ۲۰۱۶،۔۔وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

یونیورسٹی مقالات میں حیدر قریشی کا جزوی مگر اہم ذکر

۱۔اردو میں ماہیا نگاری از ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

۲۔رحیم یار خان کے جدید شعراء کا تصورِ محبوب از فرزانہ یاسمین

سال ۲۰۱۷ء۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور، **ایم فل کا مقالہ**

نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۳۔''ضلع رحیم یار خان کے شعراء گوہر ملسیانی، منور نقوی، حیدر قریشی کا خصوصی مطالعہ'' از محمد بلال قادر

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۴۔''خان پور میں اُردو غزل کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ'' از نذیر بزمی

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۵۔اُردو میں میراجی شناسی کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ از ساجدہ پروین **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔اسلام آباد۔سال ۲۰۱۴ء

۶۔''لالۂ صحرا''۔۔۔''ادب جہاں''۔۔۔''جدید ادب'' کی ادبی خدمات از ثنا اظہر

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس، ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔حیدرقریشی فکروفن   مصنف:محمد وسیم انجم
(مطبوعہ۱۹۹۹ء) ناشر:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان
۲۔حیدرقریشی فن اور شخصیت
مرتبین: نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑبولے (مطبوعہ۲۰۰۲ء)
ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا
۳۔حیدرقریشی کی ادبی خدمات
مرتب:ڈاکٹر نذر خلیق (مطبوعہ۲۰۰۳ء) ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان
۴۔حیدرقریشی شخصیت اور فن۔۔۔منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔
اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء
ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان
۵۔حیدرقریشی سے لیے گئے انٹرویوز
مرتب:سعید شباب (مطبوعہ۲۰۰۴ء) ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ
۶۔ادبی کتابی سلسلہ عکاس حیدرقریشی نمبر۔۔۔مدیرومرتب:ارشد خالد
ناشر:عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)
۷۔حیدرقریشی کی شاعری   مرتب:ہردے بھانو پرتاپ
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔(مطبوعہ۲۰۱۳ء)
۸۔حیدرقریشی شخص وعکس   مدیرومرتب:ارشد خالد
ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(۲۰۱۴)
۹۔حیدرقریشی کا ادبی سفر   عامر سہیل کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں
ناشر: سقراط بکس۔ایبٹ آباد۔۲۰۱۵ء

حیدرقریشی پر ترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''اسباق'' پونہ شمارہ:فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر:نذیر فتح پوری
۲۔حیدرقریشی (بطور افسانہ نگار) مطبوعہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی۔
شمارہ مئی تا دسمبر۱۹۹۷ء۔ہم عصر اردو ادب نمبر۔۔۔   ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی
۳۔اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدرقریشی'' ہفت روزہ ہوٹل ٹائمز اسلام آباد ۲۲مئی تا ۲۸ مئی ۱۹۹۸۔   مرتبین:اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم
۴۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی ''ادبِ عالیہ'' وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز:ریاض ہانس
۵۔خصوصی مطالعہ ''مہرِ امروز'' مطبوعہ ماہنامہ کائنات شمارہ مئی۲۰۰۴ء
(urdudost.com) ایڈیٹر:خورشید اقبال
۶۔گوشۂ حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخار امام صدیقی
۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی ادب ساز دہلی (تقریباً ۵۰صفحات میگزین سائز پر مشتمل)
شمارہ:۶،۷،جنوری تا جون ۲۰۰۸ء،ایڈیٹر:نصرت ظہیر
۸۔خصوصی مطالعہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل''
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰)   مدیر:ارشد خالد
۹۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد،مطبوعہ،ادبی کتابی سلسلہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء)
مدیر:ارشد خالد
۱۰۔مطالعۂ خاص۔ایک کتاب:''عمرِ لاحاصل کا حاصل''۔
مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ ۲۰۱۱ء۔مدیرومرتب:ارشد خالد
۱۱۔ایک گوشہ حیدرقریشی کے لیے۔دوصفحات پر مشتمل۔ روزنامہ پیغام دہلی شمارہ:۱۰مئی ۲۰۱۴ء،
ایڈیٹر:مطیع الرحمٰن عزیز
۱۲۔''ایک گوشہ حیدرقریشی کی تحقیق وتنقید نگاری کے لیے''۔
مطبوعہ عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد،کتاب نمبر۲۸۔اپریل ۲۰۱۸ء۔مدیرومرتب:ارشد خالد

انٹرنیٹ پرحیدرقریشی کی تمام کتابوں کی پی ڈی ایف فائلز

خود سے پہلے

ابا جی اور امی جی۔۔۔۔۔حیاتِ مبارکہ حیدر۔۔۔۔مبارکہ محل

شعری مجموعے

سلگتے خواب،۔۔عمرِ گریزاں،۔۔محبت کے پھول،۔۔دعائے دل،۔۔دردسمندر،۔۔زندگی،

نثری مجموعے

روشنی کی بشارت،۔۔۔قصے کہانیاں،(افسانے)۔۔۔میری محبتیں (خاکے)

کھٹی میٹھی یادیں،۔۔۔قربتیں، فاصلے (انشائیے)۔۔۔ سوئے حجاز (سفرنامہ)

تحقیق و تنقید

حاصلِ مطالعہ،۔۔تاثرات،۔۔مضامین اور تبصرے،۔۔مضامین ومباحث

ستیہ پال آنند کی بودنی، نابودنی،۔۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت،

وزیر آغا عہد ساز شخصیت،

ماھیا کے حوالے سے تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری،۔۔۔اردو ماہیے کی تحریک،

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما،۔۔۔اردو ماہیا،۔۔۔ ماہیے کے مباحث،

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر،۔۔۔خبرنامہ،۔۔۔اِدھر اُدھر سے،۔۔۔چھوٹی سی دنیا،

حیدرقریشی کی مذکورہ بالا تمام کتابیں، الگ الگ کتاب کی صورت میں اس لنک پر دستیاب ہیں

http://my27books.blogspot.de/

انٹرنیٹ پرحیدرقریشی کی کتابوں کی پیش کش کا ایک اور انداز

چھ شعری مجموعے ایک جلد میں

''قفس کے اندر''

۱۵۲ صفحات کے عوامی ایڈیشن اور ۶۱۸ صفحات کے انٹرنیٹ ایڈیشن دونوں ساتھ ساتھ

افسانوں، خاکوں، یادوں، انشائیوں اور سفرناموں پر مشتمل چھ نثری مجموعے ایک جلد میں

''خواب کے اندر خواب''

اردو ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل پانچ کتابیں ایک جلد میں

''اردو ماہیا تحقیق وتنقید''

علمی وادبی موضوعات پر چھ تنقیدی مجموعے ایک جلد میں

''ہمارا ادبی منظرنامہ''

پانچ شعری اور چھ نثری مجموعوں پر مشتمل میگزین سائز کتاب

''عمرِ لاحاصل کا حاصل''

مذکورہ بالا کلیات کی صورت میں حیدرقریشی کی کتابیں اس لنک سے لے سکتے ہیں۔

http://kuliat-library.blogspot.de/

حیدرقریشی کے فن کے حوالے سے مرتب کی گئی اور لکھی گئی کتابیں

اخبار و ادبی رسائل کے نمبر اور گوشے اور یونیورسٹیوں کے دستیاب تحقیقی مقالات اس لنک پر

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/